جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں۔

نام کتاب	اسلام اوراد یانِ عالم
تقاریر	سید العلماء علامہ علی نقیؒ
تالیف	عابد عسکری فاضلِ قم
ترتیب نو	قلب علی سیال
کمپوزنگ	الحمد گرافکس لاہور (فضل عباس سیال)
ناشر	معراج کمپنی لاہور
تاریخ اشاعت	2014ء
طبع	اوّل
قیمت	

ملنے کا پتہ

معراج کمپنی

LG-3 بیسمنٹ میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور۔

فون: 0321-4971214/0423-7361214

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

مکرمی ومحترمی ____________ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

''معراج کمپنی'' دینی کتب کی اشاعت کے حوالہ سے ایک جانا پہچانا ادارہ ہے۔ادارہ عرصہ دراز سے دینی کتب کی اشاعت میں اپنی خدمات انجام دے رہا ہے۔ادارے کا مطمع نظر عوام تک بہتر اور سستے ترین انداز میں کتب کی ترسیل ہے۔اللہ تعالیٰ ادارہ ھذا کو اس عظیم کام کی انجام دہی کیلئے بھرپور وسائل عطا فرمائے۔

زیرِ نظر کتاب'' اسلام اور ادیانِ عالم'' سید العلماء علامہ علی نقیؒ کی پانچ مجالس پر مشتمل تقریری مجموعہ ہے۔اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ دنیا میں کئی دین ہیں یعنی مذاہبِ عالم کی تعداد بہت زیادہ ہے۔لیکن کیا تمام دین منزلِ نجات تک لے جائیں گے یہ ممکن نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین صرف اسلام ہے اور یہی معیارِ نجات ہے،اس کے علاوہ کوئی دین معیارِ نجات نہیں ہے۔قارئین حضرات اس سے بھرپور استفادہ کریں۔

اُمید ہے آپ ادارہ ہذا کی اس کوشش کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور کتابِ ھذا سے بھرپور استفادہ کریں گے اور سید العلماء کی قدردانی کا حق ادا کرنے میں بھی کوشاں رہیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔والسلام

معراج کمپنی لاہور

فہرست مضامین

پہلی مجلس	6
اسلام اورادیانِ عالم	7
مصائب	28
دوسری مجلس	31
اسلام اورادیان عالم	32
مصائب	48
تیسری مجلس	51
اسلام اورادیانِ عالم	52
مصائب	67
چوتھی مجلس	69
اسلام اورادیانِ عالم	70
مصائب	93
پانچویں مجلس	95
اسلام اورادیانِ عالم	96
مصائب	116

❁❁❁❁❁

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ اَبِي الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ خَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ وَاٰلِهِ الطَّيِّبِيْنَ الطَّاهِرِيْنَ الْمَعْصُوْمِيْنَ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰهُ سُبْحَانَهُ فِيْ كِتَابِ الْمُبِيْنِ وَهُوَ اَصْدَقُ الصَّادِقِيْنَ

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ
وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٨٥﴾

پہلی مجلس

- دائرے کے اندر جو مرکز کا نقطہ ہوتا ہے، وہ ایک کے سوا نہیں ہوسکتا ہے۔ مرکز سے ہٹے ہوئے نقطے بے شمار ہوسکتے ہیں۔ لیکن دائرہ کا مرکز ایک کے سوا نہیں ہوسکتا۔ اس ایک کا اندازہ صرف عقل ہی کرسکتی ہے۔
- ادیان دنیا میں بہت سے ہیں مذاہب عالم میں بہت ہیں لیکن معیار نجات صرف اسلام ہوسکتا ہے، اس کے علاوہ کوئی نہیں۔
- اگر اصل نہیں ہے اور شاخیں ہیں تو وہ پھر نمائشی ہوں گی۔ نمائشی شاخوں سے زینت چمن ہو جائے گی مگر ثمر نہیں مل سکتا۔
- جب پیغمبرؐ خدا خود اپنے خیال کے مطابق تبدیلی نہ کرسکیں تو پھر چودہ سو برس کے بعد کسے حق ہے کہ اس میں تبدیلی کرسکے۔
- ہم لوگ کتنے خوش قسمت ہیں کہ جب دل چاہتا ہے، مجلس کر لیتے ہیں لیکن حسینؑ کو یاد کرنا جن کا حق تھا، ان کا دور ایسا تھا کہ وہ باپ کی مجلس نہیں کرسکتے تھے۔

اسلام اور ادیانِ عالم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ
وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٨٥﴾

(اور جو اسلام کے علاوہ کوئی دین تلاش کرے وہ اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں ہوگا۔)

تیسرے پارے کی آیت میں ارشاد ہو رہا ہے کہ جو اسلام کے سوا کوئی دین اختیار کرے، وہ ہرگز قبول نہیں ہوگا اور وہ آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔ جہاں تک مجھے علم ہے، سب سے پہلے صوفیاء کے ایک طبقہ میں یہ تصور نمایاں ہوا کہ ادیان و مذاہب سبھی حق ہیں ۔صرف تعبیرات کا فرق ہے۔ صوفیاء کا مقصد نوع انسانی کے افراد کو گلے ملانا ہو یا تفرقہ مٹانا ہو، جو بھی مقصد ان کا ہو، بہرحال یہ نعرہ ان کے ہاں ملتا ہے۔ اس کے بعد جس مذہب نے اسے زور شور سے اپنایا ہے وہ بہائی مذہب ہے۔ ان کے ہاں سرخی ہوتی ہے۔ وحدتِ ادیان یعنی تمام ادیان و مذاہب ایک ہیں۔ صوفیاء کے ہاں تو مقصد گلے ملانا اور خلقِ خدا کو ایک دوسرے کے قریب لانا تھا۔ ان کے نعرہ میں اچھائی یہ ہے کہ لوگوں کو اس مسلک کے اختیار کرنے میں آسانی ہوگئی ۔ایک عیسائی ہوتے ہوئے بس بہاء اللہ کو مان لے تو وہ بہائی ہوگیا اور کوئی مسلمان، مسلمان ہوتے ہوئے بظاہر

بہاء اللہ کو مان لے تو وہ بہائی ہوگیا۔ اس طرح سے ان کو مردم شماری میں اضافہ کی زیادہ گنجائش مل گئی اور کسی سے کسی بحث کی صورت نہیں رہی کیونکہ کسی میں کوئی تبدیلی پیدا کرنا مقصود نہیں ہے۔ بس صرف بہاء اللہ سے انتساب حاصل کر لینا ہے اور وہ بہائی ہو جائے گا۔

چنانچہ ایک بڑے مبلغ تھے پریتم سنگھ۔ اسی طرح بہائیت کی ایک عیسائی خاتون بہت بڑی مبلغہ تھیں۔ ایک تو اس مذہب کا جزو وحدتِ ادیان تھا۔ اسی طرح جتنے تمدن جدید کے تقاضے ہیں سب جز و دین بنا لئے گئے۔ مثلاً چھری کانٹے کا کھانا جزودین ہے۔ جس طرف دنیا جارہی ہو، وہی راستہ ٹھیک ہے۔ ریفارمر اور لیڈر میں فرق سنا تھا کہ ریفامر اپنے پیچھے چلانا چاہتا ہے اور لیڈر قوم کے پیچھے چلتا ہے۔ یہ لیڈر اور ریفارمر میں فرق سنا تھا۔ مگر یہ مذہب وہ ہے جو عوام کے پیچھے چلتا ہے۔ عوام جس راستے پر جارہے ہوں، وہی مذہب ہے۔ اس دور میں ترقی پسند طبقہ جو مذہب میں اپنی روشن خیالی کی بناء پر یہ کہتا ہے کہ یہ عقائد کے جھگڑے بیکار ہیں، اسی کو کبھی اس لباس میں پیش کیا جاتا ہے کہ بہت سے راستے ہیں اور منزل سب کی ایک ہے۔ خواہ ادھر سے پہنچ جاؤ منزل تک یا اُدھر سے پہنچ جاؤ۔ گویا یہ بحث ومباحثہ مذہب کے بارے میں غلط ہے۔ یعنی ترقی پسندی کے لباس میں یہ چیز آتی ہے کہ سب مذاہب ایک ہیں۔ ہمارے ہاں کی زبان میں گویا سیکولر تصور ہے کہ بین الاقوامی طور پر سب کو ایک راستہ پر مان لینا ہے اور تمام لوگوں کو ایک دھارے پر بہا دینا ہے، یہ کہہ کر کہ دین اور مذاہب سب ایک ہیں منزل سب کی ایک ہے، راستے الگ الگ ہیں۔

میں جب قرآن مجید پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے وحدت دین ملتی ہے، وحدت ادیان نہیں ملتی۔ ادیان ادھر جمع ہوئی اُدھر اس کے معنی یہ ہوئے کہ جتنے راستے ہیں

، آخر میں جا کر یہ سب منزل پر پہنچیں گے۔ اگر ایک مشرق کی طرف جارہا ہو اور ایک مغرب کی طرف جارہا ہو تو جتنا چلیں گے، اتنا ایک دوسرے سے دور ہوں گے، قریب کبھی نہیں ہوں گے۔ اگر منزل ایک اور فرض کیجئے کہ طریقہ پہنچنے کا مختلف ہو، کوئی سیدھا ہو اور کوئی پیر پھیرے ہو، تو اُمید ہے کہ آخر میں پہنچ جائیں گے۔ لیکن اگر رخ ہی الگ الگ ہوئے تو کیونکر منزل ایک ہو جائے گی؟

عقلی طور پر جہاں وجود اور عدم میں بحث ہو، جہاں ''ہے اور نہیں ہے'' کا معاملہ درپیش ہو، وہاں یہ ہو ہی نہیں سکتا ہے ''ہے بھی'' صحیح ہو اور ''نہیں بھی ہے'' صحیح ہو۔ قرآن مجید کیا کہہ رہا ہے:

وَمَنۡ يَّبۡتَغِ غَيۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِيۡنًا فَلَنۡ يُّقۡبَلَ مِنۡهُ‌ ۚ
وَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۸۵﴾

جو اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرے گا، اس سے کچھ قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔

یعنی ادیان عالم سب وہ نہیں ہو سکتے جو منزل نجات تک پہنچائیں بلکہ تمام ادیان میں اگر اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرے گا تو وہ کبھی منزل نجات تک نہیں پہنچ سکتا اور اسی نجات نہ ہونے کی تعبیر ہے آخر میں کہ:

وَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۸۵﴾

وہ آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔

اسی گھاٹے سے بچنے کا نام نجات ہے۔ ایک تصور اسی طرح کا یہ ہوگیا ہے کہ اصل معیار نجات اعمال ہیں۔ اصل معیار نجات کردار ہے، اسی کیلئے کسی شاعر

کا شعر مجھے یاد ہے کہ:

ہوگی نجات اس کی، عمل جس کے نیک ہیں
کافر ہو وہ عقیدہ میں یا دیندار ہو

یعنی نجات میں یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ کون کافر ہے، کون مومن ہے۔ نجات میں بس یہ دیکھا جائے گا کہ اعمال کس کے اچھے ہیں، اگر اعمال اچھے ہیں تو وہ نجات کا حقدار ہے اور اگر اعمال برے ہیں تو وہ نجات سے محروم ہے۔ یہ ایک تصور ہے جو دماغ انسانی کیلئے اختیار کیا گیا ہے کہ یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہ کرنی پڑے کہ کون حق ہے اور کون باطل ہے، ایک محدود طبقے میں کسی چور دروازے سے اسلام میں تصور ہوا کہ دو شخص آپس میں لڑ رہے ہوں تو یہ نہ دیکھو کہ کون حق ہے اور کون باطل ہے، یہ بھی جنت میں جائے گا، وہ بھی جنت میں جائے گا۔ یہ تصور جو آیا اسلام میں، وہ صرف ذوق انتقاد کو گھٹانے کیلئے اور اشخاص میں امتیاز کا شعور کم کرنے کیلئے آیا۔ اس سلسلہ میں یہ کہا گیا کہ مختلف پردے رکھے گئے غلطی کو غلطی نہ سمجھنے کیلئے کہ جو چیز غلط ہے، اسے غلط نہ کہا جائے اور یہ کہا کہ ہم کو اس سے مطلب ہی کیا کہ کون صحیح ہے، کون غلط ہے کون اچھا ہے، کون برا ہے؟ ہزار ڈیڑھ ہزار برس پہلے کی شخصیات میں بحث سے فائدہ ہی کیا ہے؟

معلوم ہوتا ہے کہ بحث کوئی خطرناک چیز ہے، اس لئے یہ افیون کھلانا منظور ہے تاکہ یہ احساس کہیں بیدار نہ ہو جائے کہ کون اچھا ہے اور کون برا ہے۔ اس منزل میں یہ کہا جاتا ہے کہ بہتر یہی ہے کہ سب کو اچھا کہیں۔ برا کہنے کی ذمہ داری بہت ہے، لہٰذا سب کو اچھا ہی کہا جائے۔ اس سلسلہ میں مجھے ابوالکلام آزاد کا ایک بہت ہی حسین جملہ یاد آیا، انہوں نے یہ فرمایا کہ اگر ہم یہ اصول بنالیں کہ برے کو بھی اچھا کہیں تو جو واقعی اچھے ہیں، ان کیلئے ہمارے پاس کیا رہ جائے گا؟

جب میں قرآن مجید کو دیکھتا ہوں تو دین تو واقعی صرف ایک ہے کہ:

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ قف

''دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے''۔

قرآن مجید کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ ادیان تو ایک نہیں ہیں مگر دین واقعی ایک ہے اور بنام ادیان جو چیزیں ہوں، وہ اصطلاح قرآن میں اَهْوَاءُ ہیں۔ خواہشات نفسانی ہیں اور لوگوں کی اغراض کے سانچے ہیں جو بنام دین ڈھل گئے ہیں۔ پتہ چلتا ہے کہ سب ادیان حق نہیں ہیں۔ اگر سب حق ہوتا تو مذاہب کی کثرت پیدا ہی نہ ہوتی کیونکہ حق ایک ہوتا ہے، اس میں کثرت کی گنجائش ہی نہیں ہوتی اور چونکہ حق ایک ہوتا ہے اور باطل راستے بہت ہوتے ہیں، اس لئے عقلی طور پر حق پرستوں کی تعداد کم ہوتی ہے، باطل پرستوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ اس کیلئے ایک مثال ریاضی کی ہے، کہ دو نقطوں کے درمیان سیدھا خط ایک ہی ہوسکتا ہے کیونکہ سیدھا خط وہ ہے کہ جو سب سے چھوٹا ہو، جو دو نقطوں کو ملا سکے۔ وہ بس ایک ہی ہوسکتا ہے۔ کج راستے بہت ہوسکتے ہیں۔ غیر مستقیم راستے بہت ہوسکتے ہیں۔ لیکن سیدھا خط ایک ہوگا۔ وہ سب سے نزدیک ہوگا اور سب سے چھوٹا ہوگا۔

شاعروں سے معذرت کے ساتھ، جناب! کہنے والے نے جو یہ کہہ دیا کہ ''راہ راست بروگرچہ دور باشد'' یہ ہو ہی نہیں سکتا ہے جو راہ راست ہوگی، وہ قریب ترین ہوگی۔ وہ نگاہ کو دور معلوم ہوگی مگر حقیقت کے لحاظ سے وہ قریب ترین ہوگی اور اگر وہ قریب نہیں ہے تو وہ نگاہ کو راست معلوم ہوگی مگر حقیقت میں کج ہوگی کیونکہ وہ ایک نقطہ ہوگا راہ راست کا۔ جہاں سے قدم ہٹا اور راسہ غیر راست ہوئی۔

تو وہ جن کے قدم جمے رہیں راہ راست پر، وہ لوگ کم ہوں گے۔ جہاں سے جو بھکے گا، وہیں سے راستہ اس کا غیر راست ہوجائے گا۔ لہٰذا حق پرست کم ہوں گے، باطل پرست زیادہ ہوں گے اسی راہ راست کا نام صراط مستقیم ہے۔

یہ ایک ریاضی کی مثال تھی۔ دوسری مثال یہ ہے کہ دائرے کے اندر جو مرکز کا نقطہ ہوتا ہے، وہ ایک کے سوانہیں ہوسکتا۔ مرکز سے بنے ہوئے نقطے بے شمار ہوسکتے ہیں لیکن دائرہ کا مرکز ایک کے سوانہیں ہوسکتا۔ ایک کا اندازہ صرف عقل صحیح کرسکتی ہے۔ اتنی صحیح نظر رکھنے والے بہت کم ہیں، لہٰذا جہاں سے نظر چوکے گی، وہاں سے مرکز سے جدائی ہوگی اور ادھر مرکز سے جدائی ہوئی اُدھر کسی افراط کے نقطے تک پہنچ گیا یا یا تفریط کے نقطے تک پہنچ گیا یا ادھر چلا گیا یا اُدھر چلا گیا۔ حق جو ہوگا، وہ نقطہ وسط ہوگا۔

اس وجہ سے جو نقطہ وسطے ہے اس کیلئے کہا گیا۔

لَا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ

وہ مشرق کی طرف ہٹا ہوا ہے نہ مغرب کی طرف ہٹا ہوا ہے۔

جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا

ہم نے تم کوایک درمیانی قوم بنایا ہے۔

یہ درمیانی منزل میں ہے جو نقطہ اعتدال ہے۔ اس نقطہ کا شناخت کرنا چونکہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے، لہٰذا بھکنے والے زیادہ ہوسکتے ہیں اور صحیح نقطہ پر ٹھہرنے والے کم ہوسکتے ہیں۔ اس کیلئے عالم امثال میں شاید تمثیلی طور پر مجسم شکل میں اسے پیش کردیا کہ جب حق کا اعلان ہوا تو جو آگے بڑھ گئے تھے، انہیں پیچھے ہٹایا گیا اور جو پیچھے رہ گئے تھے انہیں آگے بڑھایا گیا۔

تمام ادیان و مذاہب میں حقیقی دین ایک ہے۔ ہمارے نزدیک آدمؑ جو لائے، وہ بھی اسلام تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام جسے لائے، وہ بھی اسلام تھا، حضرت ابراہیمؑ جس راستہ پر قائم رہے، وہ بھی اسلام تھا، حضرت موسیٰؑ اور عیسیٰؑ نے جس کی تبلیغ کی، وہ بھی اسلام تھا۔ غرض ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء میں کون کہتا ہے کہ سب عرب میں ہوئے جبکہ قرآن نے کہا ہے کہ کوئی امت ایسی نہیں جس میں کوئی ہدایت کرنے والا ہماری طرف سے نہ ہوا ہو۔ جن کے نام قرآن نے لئے ہیں، ان پر تفصیلاً ہمیں ایمان لانا ہے اور اس کے بعد آنکھیں بند کر کے کہنا ہے کہ جو جو اس کی طرف سے آئے ہیں، ہم سب پر ایمان رکھتے ہیں۔ ہم کسی کی تصدیق نہیں کر سکتے کیونکہ کوئی ثبوت نہیں ہے۔ لیکن ہم برا بھی نہیں کہیں گے قبل والے کو جو ہمارے رسولؐ سے پہلے ہو، جب کہ ہمارے قراان نے کہہ دیا ہے کہ ہر امت میں ہم نے رہنما بھیجا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ہندوستان میں جن کے نام لئے جا رہے ہیں، وہ سچے نبی نہ ہوں؟ ہم اس بارے میں اتنے محتاط ہیں کہ ہم ان کے بارے میں کوئی ایسا جملہ نہیں کہتے کہ اگر وہ سچے نبی ہوں، تو وہ جملہ توہین قرار پائے۔ لیکن ہم تصدیق بھی نہیں کر سکتے کیونکہ اس کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں ہے۔

ہاں! اگر ہمارے رسولؐ کے بعد کوئی اعلان کرے گا تو پھر ہم قوت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ غلط ہے، اس لئے کہ وہ کہہ گئے ہیں کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

ادیان دنیا میں بہت ہیں، مذاہب دنیا میں بہت ہیں لیکن معیار نجات صرف اسلام ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی نہیں اور اسلام بھی وہ جو خدا کی نظر میں اسلام ہو۔ اسلام لقب ہوجانا اور بات ہے، قانونی حقوق مل جانا اور بات ہے لیکن اس نے وہاں کے نتائج کو اپنے علم غیب سے متعلق رکھا ہے تو وہاں اس کی نظر میں اسلام ہونا چاہئے۔ جب اس کی نگاہ میں اسلام ہو، تب وہاں کیلئے معیار نجات

ہوگا اور جو اس کو اختیار نہ کرے ''لَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ'' وہ قبول نہیں ہوگا۔

اب میں جب قرآن مجید کا مطالعہ کرتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ اسلام اور اس کی بلند ترین شکال ایمان بھی نجات کا ذریعہ نہیں، بایں معنی کہ اب اس کے بعد اعمال کی جانچ ہوگی۔ قرآن کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اصل جزا اعمال کی ہوتی ہے مگر ایمان شرط صحتِ اعمال ہے۔ اس کو عام مثال میں یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ جیسے کوئی داخلہ امتحان ہو، جس میں یہ شرط ہو کہ جو بی اے ہوگا، اس کو داخلہ کے امتحان مین لیا جائے گا۔ اب اگر کوئی بی اے نہیں ہے، اس نے پرچہ بہت اچھا بھی کیا ہو مگر اس پرچہ کو دیکھا ہی نہ جائے گا کیونکہ پہلی شرط ہی اس میں نہیں ہے۔ اسی طرح اعمال کے پرچوں میں جانچ پڑتال اس وقت ہوگی جب ایمان ہو۔

لہٰذا وہ شخص جو مدعی ایمان ہوا اور اعمال سے غرض نہ رکھے، وہ اس بی اے کے مثل ہے جو کاپی سادہ بھیج دے، تو کیا وہ پاس ہو جائے گا؟ اور جو ایمان ہی سرے سے نہ رکھتا ہو، وہ چاہے پرچہ بہت اچھا کرے، وہ اس شخص کی مثل ہے جو پرچہ اچھا کرے مگر بی اے نہ ہو اور بی اے بھی ہے اور پرچہ اچھا کرے، چلئے اس قابل ہی سہی کہ 32 فیصد نمبر مل جائیں تو وہ کسی درجہ کی کامیابی کا امیدوار ہو سکتا ہے۔ یہ جو ہمارا محاورہ ہے اصول دین اور فروع دین، یہ فروع دین کہنا اہمیت گھٹانے کیلئے نہیں ہے بلکہ یہ ایک حقیقت کے اظہار کیلئے ہے اور وہ یہ کہ جو تعلق شاخ کو اصل کے ساتھ ہوتا ہے، وہ تعلق ایمان کو عمل کے ساتھ ہوتا ہے۔ جس طرح اصل یعنی جڑیں زمین کے اندر پھیلتی ہیں مگر آثار شاخوں کی شکل میں برآمد ہوتے ہیں، اس طرح عقائد صحیح جو معیار ایمان ہیں وہ دل و دماغ کی تہوں میں پھیلتے ہیں اور آثار اس کے اعضاء و جوارح سے اعمال کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ تو کیا ممکن ہے کہ اصل زندہ ہو، پائیدار ہو اور شاخیں نہ پائی جاتی ہوں۔ اگر شاخیں نہ ہو تو اصل کی خبر

لیجئے۔ پھر سینچنے کیلئے شاخوں کو پانی مین ڈبونا نہیں پڑے گا بلکہ اصل کو پانی دینا ہوگا تاکہ ان میں زندگی پیدا ہو۔ لیکن اگر اصل نہیں ہے اور شاخیں ہیں تو وہ پھر نمائشی ہوں گی۔ نمائشی شاخوں سے زینت چمن ہو جائے گی مگر ثمر نہیں مل سکتا۔

اصل موضوع پر آؤں کہ موضوع خصوصیات اسلام ہے۔ پہلی اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ جتنے دنیا کے مذاہب ہیں، ان کی نسبت یا کسی شخص کی طرف ہے یا کسی سرزمین کی طرف ہے۔ مثلاً عیسائی مذہب، حضرت عیسیٰؑ سے اس کا تعلق ہے۔ ان کی طرف اس کی نسبت ہے۔ موسوی مذہب حضرت موسیٰؑ سے متعلق ہے۔ اس کی دوسری تعبیر یہودی کہہ دیا۔ تو یہودا جناب یعقوبؑ کے بیٹے تھے۔ ان کی طرف نسبت ہوگی۔ اسرائیلی کہہ دیا تو اسرائیل خود جناب یعقوبؑ کا لقب ہے، ان کی طرف نسبت ہوگئی۔ غرض کسی شخص کی طرف اس کی نسبت ہے۔ ہمارے پاس ہندوؤں کا رائج الوقت مذہب جو ہے، اس کی ایک سرزمین کی طرف نسبت ہے یعنی ہند کی طرف نسبت۔

جب شخصیت کی طرف نسبت ہو یا سرزمین کی طرف نسبت ہو تو چونکہ نسبت کا مرکز محدود ہے، لہٰذا دین لامحدود ہو ہی نہیں سکتا اور ہمہ گیر نہیں ہو سکتا۔ حضرت عیسیٰؑ کی طرف نسبت ہے تو جو عیسیٰؑ سے کوئی دلچسپی نہ رکھتے ہوں، وہ بلا کسی تردد کے کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں مطلب نہیں۔ دنیا اسلام کا احسان مانے کہ اس نے ان انبیاء کی تصدیق کر کے ہمیں ایمان لانے پر مجبور کر دیا ورنہ جو قرآن کو نہ مانے، وہ حضرت موسیٰؑ کو کیوں کہے گا کہ ہم ان کو سچا نبی مانتے ہیں؟ تمام دنیا کے مذاہب میں اپنے نبی کی صداقت کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ صرف ان کی صداقت کا ثبوت ہمارے لئے قرآن میں ہے۔ توریت میں دیکھ کر ہم حضرت موسیٰؑ کو سچا نبی مان ہی نہیں سکتے۔ قرآن کے صدقہ میں مانتے ہیں۔ انجیل کو دیکھ کر حضرت عیسیٰؑ کی صداقت کو ہم مان ہی

نہیں سکتے ۔ جب انجیل میں کردار ایسا پیش کیا جارہا ہو جو ہمارے نزدیک ایک سچے نبی کی شان کے لائق نہیں ہے تو ہم انجیل کو دیکھ کر کیوں ایمان لائیں گے؟ قرآن میں دیکھ کر ایمان لا سکتے ہیں، مجبور ہیں۔

تو جو شخص حضرت موسیٰؑ سے لگاؤ نہ رکھتا ہو، وہ بلا تکلف کہہ سکتا ہے کہ مجھے موسوی دین سے کیا مطلب؟ فرض کیجئے کہ جسے ہند کی سرزمین سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس کی طرف نسبت رکھنے والا مذہب ہندو ہے، تو وہ کہے گا کہ مجھے ہندو مذہب سے کیا مطلب؟ میں کوئی ہند کا رہنے والا ہوں؟ آریا ایک قوم ہے۔ مذہب کا نام آپ آریا رکھ لیں تو جس کا تعلق آریا قوم سے نہیں، وہ کہہ سکتا ہے کہ مجھے آریا مذہب سے کیا تعلق؟ جب نسبت کا مرکز محدود ہو گیا تو وہ دین لامحدود کہاں رہ سکتا ہے؟ صرف ایک اسلام ہے کہ اس کی نسبت نہ کسی شخصیت کی طرف ہے نہ کسی خطہ ارض کی طرف ہے۔ یہ عربی دین نہیں ہے، یہ ہاشمی دین نہیں ہے، یہ حجازی دین نہیں ہے۔ دوسروں نے اپنے مذہب کی ردیف قافیے میں اس کو دین محمدی کہنا شروع کیا، جو ہم بھی بے سوچے سمجھے تقلید اغیار میں کہنے لگے ورنہ اس دین کو رسولؐ نے کب کہا کہ میرا دین؟ کب ان کے کسے پیرو خاص نے کہا کہ یہ دین محمدی ہے۔ یہ دین محمدی کہنا درحقیقت دوسرے نے اپنے مذاہب کے ردیف اور قافیے میں اس کا یہ نام تجویز کیا ہے۔ جیسے بے سمجھے ہم نے ان کا لباس اختیار کر لیا۔ جیسے ہم نے ان کی وضع قطع اختیار کر لی۔ ویسے ہی اپنے دین کیلئے یہ لفظ بھی اختیار کر لیا۔ لامحدود چیز کو ہم نے ایک شخصیت کی طرف نسبت دے کر محدود بنا دیا۔ جس طرح اس دین کو دین محمدی کہنا غیروں کی تقلید ہے، بالکل اسی طرح ایک فقہ کو جو درحقیقت محمدؐ کی فقہ تھی، اس کو درمیان کے ایک امام کی طرف منسوب کرنا، یہ بھی، جو اس دور کے دوسرے اماموں کی طرف نسبت دی گئی تھی کہ کوئی حنفی تھا، کوئی شافعی، تو ہم نے بھی

اس کو فقہ جعفری کہنا شروع کر دیا۔ نہ دین، دین محمدی ہے، نہ فقہ، فقہ جعفری ہے۔ دین، دین خدا ہے اور فقہ، فقہ محمد مصطفیٰؐ ہے۔

اسلام جو آیا تھا، آدمؑ کے وقت، انہوں نے اس کو کچھ ایسے مکمل طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا کہ گویا اس پرانی چیز کو اپنا بنا لیا، اس لئے اسلام کے بانی کہلانے لگے ورنہ اسلام کے بانی کب ہیں، مبلغ اسلام ہیں۔ اسی طرح وہ احکام جو حضرت محمد مصطفیٰؐ لائے تھے، وہ بھی انہوں نے بنائے نہیں تھے، وہ اس شریعت کے لانے والے تھے۔ اس کی تشکیل کرنے والے نہیں تھے، اس کی تصنیف کرنے والے نہیں تھے۔ اس لئے کہا گیا کہ ہم نے آپ کو شریعت کے ایک راستے پر چلایا ہے۔ دوسرے لوگ آپ سے کہتے تھے کہ ذرا اس کو بدل دیجئے تو آپ نے فرمایا کہ مجھے اس کو بدلنے کا حق نہیں ہے۔ وہ کہتے تھے، یا قرآن کو کچھ تبدیل کر دیجئے یا کچھ اس کے علاوہ اور پیش کیجئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ میں اپنی طرف سے اس میں کچھ تبدیلی کروں میں نہیں پیروی کرتا مگر اس کی جو اللہ کی طرف سے مجھ پر وحی اتری ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے رسول بھی شریعت کے معاملہ میں ''مُتَبِعْ'' ہیں، ''مُتَبَّع'' نہیں۔ ان کا کام اتباع کرنا۔ ہے۔ یہی مطالبہ آج کل بڑے زور و شور سے چل رہا ہے، شریعت کی تبدیلی کا، ایسے لوگ جن کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ شریعت میں ترمیم کے مبلغ ہیں۔ چنانچہ ایک پروفیسر لندن کے ایڈرسن صاحب، وہ قانونِ اسلام کے معلم ہیں۔ باقاعدہ دورے کرتے ہیں ۔ جگہ جگہ جا کر تقریریں کرتے ہیں اس موضوع پر کہ شریعت اسلام کو زمانہ حاضر کے مطابق بنایا جائے، علی گڑھ آئے، دہلی میں وہ ذاکر حسین، صدر ہندوستان سے ملے تھے۔ انہوں نے کہا کہ علی گڑھ جایئے گا تو فلاں شخص سے ضرور ملئے گا۔ میرا نام لیا۔

وہ علی گڑھ آئے تو ہمارے ہاں کے لاء کے چیئر مین کے ہاں ٹھہرے۔ میرے پاس ان چیئر مین کا خط آیا کہ صاحب! جس دن سے وہ آئے ہیں، آپ کو پوچھ رہے ہیں۔ لہٰذا پہلے تو عصرانے پر آجایئے ،اس کے بعد ملاقات کر لیجئے۔ میں وہاں گیا تو انہیں معلوم تھا کہ میں شیعہ ہوں اور شیعوں میں اجتہاد کا دروزاہ کھلا ہوا ہے۔ میری صورت دیکھ ہی گویا انہوں نے مجھے یہ رشوت دی کہ ہمیں تو بس آپ لوگوں سے یہ امید ہے کہ آپ ہمارا ساتھ دیجئے گا۔

میں نے انہیں نقد مایوس کر دینا چاہا۔اس زمانے میں معیار اخلاق یہ ہے کہ کوئی بات نہیں بھی کرنی ہے تو اس کو ذرا اس طرح سے کہو کہ وہ عرصہ میں سمجھیں کہ نہیں کریں گے۔مگر میں اس اخلاق کا قائل نہیں ہوں۔ جونہی انہوں نے یہ کہا کہ ہمیں تو آپ ہی لوگوں سے امید ہے کہ آپ ہمارا ساتھ دیں گے ،اس لئے کہ آپ کے ہاں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔تو میں نے فوراً کہہ دیا کہ جی ہاں! اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے مگر ایجاد کا دروازہ بند ہے۔ وہ میرے جواب سے ذرا تپ تو اسی وقت گئے ،تصویر کھینچنے لگی تو میز بان نے مجھے ان کے ساتھ بٹھایا تو انہوں نے گویا مجھ پر چوٹ کی ،مولوی ہونے کے رشتے سے۔ مجھ سے کہا کہ یہ بدعت تو نہیں ہے؟ میں نے کہا: جی! اگر یہ بدعت ہے تو میں خود بدعت ہوں۔ ہر نئی بات بدعت ہے تو میں اس بناء پر قدیم کب ہوں؟

یہ تصور کہ دین اور شریعت میں وقت کے تقاضوں کے مطابق بتدیلی آنی چاہئے تو اس سلسلہ میں خود پیغمبرؐ خدا نے فرمایا دیا کہ میرا اس میں بس نہیں۔تو جب پیغمبرؐ خود اپنے خیال کے مطابق تبدیلی نہ کرسکیں تو پھر چودہ سو برس کے بعد کسے حق ہے کہ اس میں تبدیلی کر سکے، اس کو بدل سکے۔لہٰذا قانون بھی ہمارے ہاں خدا کی طرف سے اور نظام عمل بھی خدا کی طرف سے۔ جو جو چیز خدا کی طرف سے مان لی

جاتی ہے، پھر اس میں اختلاف نہیں ہوتا۔ خدا کی طرف سے مان لیا رسولؐ کو تو پھر دو رسول نہیں ہوئے۔قبلے کو خدا کی طرف سے مان لیا تو پھر دو قبلے نہیں ہوئے۔کتاب کو خدا کی طرف سے مان لیا تو پھر دو قرآن نہیں ہوئے۔جس جس چیز کو اس کی طرف مان لیا، پھر اس میں اختلاف نہیں ہوا۔ جہاں سے اپنا اختیار صرف ہو گیا، بس وہیں سے اختلاف پیدا ہو گیا۔ اسی لئے اگر قانون اس کی طرف سے ہو تو جسے کم ملا، وہ بھی سمجھے گا کہ میرے ساتھ ناانصافی نہیں ہوئی۔مثلاً شریعت اسلام میں لڑکے کا دُہرا حصہ،لڑکی کا اکہرا حصہ۔تو کوئی اسی کو نہ مانتا ہو جس نے قانون بھیجا ،اسی کو نہ مانتا ہو جس نے قانون پہنچایا، وہ کہے گا کہ ہمارے ساتھ ناانصافی ہوئی۔لیکن جو قانون بھیجنے والے کو بھی جانتا ہے اور قانون پہنچانے والے پر بھی ایمان رکھتا ہے، اس نے یہ شکایت کبھی نہیں کی ہوگی کہ ہمیں اکہرا حصہ کیوں دیا جاتا ہے۔

شکوہ جب ہوتا ہے کہ جو خدا نے لڑکی کا حق مقرر کیا ہے، وہ بھی نہ دیا جائے۔ لڑکی کو اکہرا حصہ ملنے پر اگر کوئی کہے کہ یہ ناانصافی ہے تو اس کو میں سمجھا سکتا ہوں کہ یہ ناانصافی عورت کے ساتھ نہیں ہے۔ اس میں شخصیت کا سوال نہیں تھا۔ بلکہ کچھ حکیمانہ مصالح تھے، اس لئے کہ ان احکام کی تبلیغ خود اس نے کی ہے جسے خدا نے لڑکی ہی عطا کی تھی۔

جس طرح بیٹوں کی موجودگی میں پوتے کی محرومی پر جو لوگ آنسو بہاتے ہیں کہ (معاذ اللہ) اسلام نے یہ کیسا بیدردی کا پیغام پہنچا دیا۔ میں کہتا ہوں کہ تمہیں اس میں بیدردی کے تصور کا کیا حق ہے جبکہ جس نے یہ حکم پہنچایا، وہ خود اس دور سے گزرا ہے کہ اس کے باپ کا اس کے دادا کے سامنے انتقال ہو گیا۔ چچا نے پرورش کی تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں یہ تو دلیل ہے اس کی کہ اس شریعت میں جذبات کو دخل نہیں تھا ،حقانیت کا معیار تھا۔

اس دین کا تعلق کسی شخصیت کے ساتھ نہیں ہے۔ دین محمدی بھی اس کو کہنا دوسروں کی تقلید ہے۔ اس کا نام کیا ہے؟ دین اسلام۔ اور اسلام کس کیلئے؟ اسلام کے دو معنی ہیں۔ ایک ''سرنہادن بہ طاعت'' اطاعت کیلئے سر جھکا دینا۔ دوسرے ''سپردن'' اپنے کو سپر کر دینا۔ یہ دونوں چیزیں کس سے متعلق ہیں؟

لَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

''اس کیلئے اسلام لائے ہوئے ہیں جتنے آسمان میں ہیں اور جتنے زمین میں ہیں''۔

کس کیلئے؟ خدا کیلئے۔ رسولؐ نے نہیں کہا کہ میرے لئے ایمان لاؤ، میرے سامنے سر جھکاؤ۔ رسولؐ کہہ رہے ہیں کہ اللہ کے سامنے سر جھکاؤ، اللہ کیلئے اسلام قبول کرو۔ تو اسلام اور حقیقت اللہ کے سامنے سر جھکانے کا نام ہے۔ اسلام اپنے کو خدا کے سپرد کر دینے کا نام ہے۔ سپرد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ بس اس کا اختیار ہم مانتے ہیں۔

سپردم به تو مایه خویش را
تو دانی حساب کم وبیش را

حضور والا! سپرد کر دینا، اس میں بھی بے اختیاری مضمر ہے۔ اسلام کا یہ تعلق براہ راست ہے۔ میں کہتا ہوں چونکہ اسلام ایک جماعتی لقب ہو گیا ہے، اس لئے دنیا ایک اجنبیت محسوس کرتی ہے ورنہ حقیقتِ اسلام پیش کیجئے۔ اسلام کے حقیقی معنی دنیا کے سامنے لائیے۔ تو فرض کیجئے کہ میرے مدنظر نوع انسانی ہے۔ میں کہوں کہ موسوی دین اختیار کرو تو جو موسیٰؑ کو نہیں مانتا، تو وہ کہہ سکتا ہے کہ ہم نہیں مانتے۔ ہمیں موسیٰؑ سے تعلق نہیں ہے۔ میں کہوں کہ عیسوی دین اختیار کرو تو ایک بڑا طبقہ آواز

بلند کر سکتا ہے کہ ہم نہیں مانتے، اس لئے کہ حضرت عیسیٰؑ سے ہم بیگانہ ہیں۔ میں کہوں کہ فلان سرزمین کا دین اختیار کرو تو ایک بڑا مجمع کہہ سکتا ہے کہ ہمیں تعلق نہیں اس سرزمین سے۔ یہ آواز آ سکتی ہے۔ لیکن اب اس مجمع کے سامنے میں کہوں کہ تم میں سے کون ہے جو خدا کے سامنے سر نہ جھکائے تو کسی بندے میں ہمت ہے کہ وہ کہے کہ میں ہوں؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر دین کی حقیقت کو پیش کیجئے تو کوئی خدا کا بندا اپنے کو بیگانہ محسوس نہ کرے گا۔

دین کا تعلق اللہ کے ساتھ ہے۔ اس لئے ہر مسلم کون ہے؟ اللہ کا بندہ ہے۔ عبادت عبودیت سے مشتق ہے اور عبودیت بندگی ہے اور وہ بندگی خدا کی بندگی ہے اور یہ چیز اتنی بلند ہے کہ جو کائنات میں سب سے بلند ذات تھی، اس کو بھی رسالت سے پہلے عبودیت کا شرف عطا کیا گیا اور وہ جوان کا سب سے نمایاں معجزہ تھا، وہ کونسا ہے؟ ہر ایک کے ذہن میں ہوگا، چاہے زبان پر اس وقت نہ آ سکے، معراج۔ تو معراج رسولؐ کی حیثیت سے نہیں تھی۔ بندہ کی حیثیت سے تھی۔ اس لئے یہ نہیں کہا:

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِرَسُوْلِهٖ

بلکہ یہ کہا:

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ

''وہ اپنے بندہ کو لے گیا''۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ رسالت کی معراج نہ تھی، ان کی بشریت کی معراج تھی۔ اب جب کشاں کشاں پہنچ گیا اس منزل معراج تک تو اب انہی الفاظ سے کہ پاک ہے وہ ذات جو لے گئی اپنے بندہ کو۔ اپنے بندے کو لے گئی اور یہ بندہ ہونا اتنا بڑا اشرف تھا کہ ہر نماز میں کم از کم ایک دفعہ نہیں تو

دو دفعہ یعنی دو رکعتی نماز ہے تو تشہد ایک دفعہ ہوتا اور اگر سہ رکعتی نماز ہے یا چار رکعتی نماز ہے تو دو دفعہ ہوگا۔تو ہر نماز میں ہم کہتے ہیں۔

اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

''میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد مصطفیٰؐ اس کے بندۂ خاص اور رسول ہیں''۔

وہ دنیا جو شرک سے بہت ڈرتی ہے، میں کہتا ہوں کہ نماز خالص اللہ کی عبادت ہے۔ یہ رسولؐ کا نام نماز میں آیا تو شرک تو نہیں ہوا؟ اور جناب! یہی گواہی دیجئے گا اور یہ الفاظ زبان پر لائیے گا تو تصور رسولؐ ہوگا یا نہیں؟ تو تصور رسولؐ اخلاص عبادت کے خلاف تو نہیں ہے جب نماز ہر مسلمان کو پڑھنا ہے اور شرک سے بھی ہر مسلمان کو بچنا ہے۔اب اس سوال کو حل کرے کوئی شرک کی آواز بلند کرنے والا۔ ہم اب ایک کشتی کے سوار ہیں۔ یا سب مشرک یا کوئی نہیں۔اب دنیا حل کرے اس سوال کو کہ تصور رسول نماز کا جز اور ذکر رسول نماز کا جزو۔تو پھر شرک نہیں ہوا؟ یا مشرک ہوجائیے، یا نماز نہ پڑھئے۔گویا مسلمان ہو کر نماز پڑھ ہی نہیں سکتے۔یعنی اچھا ہو آپ کا معیارِ توحید کہ بغیر بے نمازی ہوئے وہ موحد ہو ہی نہیں سکتے۔

اب نماز بھی پڑھنا ہے، آپ کو، ہم کو، دونوں کو اور شرک سے بھی بچنا ہے ہم کو اور آپ کو، دونوں کو۔تو جو حل میں بتاؤں، اسے قبول کیجئے اور میں کہتا ہوں شکریہ کے ساتھ قبول کیجئے اور اگر قبول نہ کیجئے تو خود کوئی حل بتائیے۔ یا نماز چھوڑیئے یا شرک کی آواز۔تو میری تو سمجھ میں جو آیا ہے، وہ یہ کہ یہ دیکھنا چاہئے کہ ان کا ذکر کیا ہوا؟ اگر یہ ذکر ہوتا کہ کسی بڑے باپ کے بیٹے ہیں تو وہ غیر اللہ کا ذکر ہوتا۔اگر یہ ہوتا کہ کس خاندان کے فرد ہیں تو وہ شاید غیر اللہ کا ذکر ہوتا ہے اگر یہ ذکر ہوتا ہے کہ صورت مبارک ایسی تھی، اگر گیسوئے مبارک کا ذکر ہوتا، دندان مبارک

کا ذکر ہوتا تو ہوسکتا تھا کہ اسے غیر اللہ کا ذکر مانیں۔لیکن یہ ذکر! کہ یہ اس کے بندے اور اس کے رسولؐ ہیں تو یہ تو عین ذکر خدا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ نماز میں اسے جزو یونہی رکھا گیا ہے کہ یہ سنت قدیمی تھی کہ ہر قوم اپنے رسول کو خدا بنا لیا کرتی تھی، لہٰذا نماز کا جزو بنا کر سدباب شرک کیا گیا۔ میں کہتا ہوں کہ وہ کہہ رہا ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ

لے گیا اپنے بندہ کو۔ اب ہر دور کے سائنس دان کو تعجب رہا ہے کہ کیونکر لے گیا؟ اس زمانہ کے اعتراضات اور تھے۔آسمان ٹھوس جسم ہے تو جاتے وقت آسمان پھٹے اور آتے آسمان پھٹے تو اس لئے کیونکر گئے؟ اب اس دور کے اعتراضات اور ہیں کہ اتنی دور جا کر ہوا کا دباؤ یوں ہوجاتا ہے اور ہوا غائب ہوجاتی ہے اور سانس لینا ممکن نہیں ہے۔غرض چکر وہی رہا ہے کہ کیونکر گئے؟ تو اس منزل پر میں یہ کہا کرتا ہوں کہ قرآن کب کہہ رہا ہے کہ یہ گئے؟ تو آپ یہ نہ پوچھئے کہ کیونکر گئے۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ وہ لے گیا۔ اب اللہ کے سب کاموں کو آپ نے سمجھا کہ کیونکر ہوتے ہیں تو یہاں بھی سمجھنے کا حق ہے۔انہی سائنس کے اعتراضوں سے گھبرا کر کچھ خیرخواہوں نے اسلام کے یا اپنے علم کے بھرم کو رکھتے ہوئے جواب نہ دے سکنے کی وجہ سے یہ کہہ دیا کہ وہ تو روحانی معراج تھی۔یعنی اب تو سائنس ہماری جان چھوڑے گی۔وہ تو جسم کے ساتھ گئے ہوتے تو یہ سب آپ کہتے، ہم کب کہتے ہیں کہ جسم کے کے ساتھ گئے۔ وہ تو خواب دیکھا تھا وہ تو روح گئی تھی۔اب نہ آسمان کا پھٹنا ہے نہ جڑنا ہے، نہ ہوا کا دباؤ ہے، کچھ بھی نہیں ہے۔تو اس آسانی کیلئے روحانی کہہ کر اعتراضات سے چھٹکارہ ہوگیا۔

تو میں اس جماعت سے کہا کرتا ہوں، چاہئے وہ علماء ہوں کہ آپ کو کون مجبور کر رہا ہے کہ معراج کو مانئے۔ بالکل چھٹکارہ ہوجائے گا، کہہ دیجئے کہ معراج ہوئی ہی نہیں۔ ہم کب کہتے ہیں؟ مجبوری آپ کو کیا ہے؟ آپ کہئے گا مجبوری یہ ہے کہ قرآن میں ہے۔ اب کیونکر نہ مانیں مسلمان رہتے ہوئے، تو میں کہتا ہوں کہ جب قرآن میں ہونے کہ مجبوری سے آپ مان رہے ہیں تو جو قرآن میں ہو، وہ مانئے۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ پاک ہے پروردگار جو لے گیا اپنے بندے کو۔ اب بندہ بحالت حیات فقط روح کا نام ہوتا ہوتو روحانی معراج مانئے اور بندہ مجسمہ روح وجسد کا نام ہوتا ہوتو پھر معراج روحانی ماننے سے کام نہیں چلے گا۔

مگر شرک کے اعتراض کو جس جواب سے میں نے حل کیا تھا اور دنیا ماننے کیلئے مجبور ہے، اسی کو پھر اصول بنالیجئے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ذکر رسول، جو شخصی خصوصیات اور مادی تشخص کے ساتھ ہو، وہ غیر اللہ کا ذکر ہے مگر جو اللہ کے رشتہ سے ہوتو ان کا ذکر عین ذکر خدا ہے۔ تو بس یہ اصول بنالیجئے کہ کسی کا بھی ذکر اس کے مادی تشخص کے ساتھ ہوتو عبادت نہیں ہوسکتا لیکن جب اللہ کی طرف نسبت سے ہوتو پھر وہ شرک نہیں ہے۔ اب اگر ہم کسی فدیہ راہ خدا کا ذکر کریں تو رشتہ مل گیا خدا سے۔ اب اگر ہم اس کا ذکر کریں تو اسے غیر ذکر خدا نہ کہو۔ اگر اس کی تعظیم کریں تو غیر تعظیم خدا نہ کہو۔ اب اس کا ذکر عین ذکر خدا ہے۔ اس کی تعظیم عین تعظیم خدا ہے۔

اب یہ دیکھئے کہ کن شخصیات کا ہم ذکر کرتے ہیں۔ کیا خدا سے بے نیاز ہو کر ہم ذکر کرتے ہیں؟ شخصیات جب فنا ہوگئی ہوں اس کے ذکر میں اس طرح کہ ان کا ذکر بغیر اس کے ذکر کے ہو ہی نہ سکے۔ میں کہتا ہوں کہ وہ ذات کہ ولادت کا ذکر کیجئے تو خانہ خدا کا نام آئے، شہادت کا ذکر کیجئے تو خانہ خدا کا نام آئے، اس کا ذکر خدا کے ذکر سے الگ کیونکر ہوسکتا ہے؟ دنیا کہتی ہے کہ حدیثیں بیان کرتے

ہیں کہ علیؑ کا ذکر عبادت ہے، یہ بھی حدیث کہ چہرہ پر نظر کرنا بھی عبادت ہے، ایک تو یہ کہ ہمارے ہاں ہی نہیں ہے، دوسروں کے ہاں بھی ہے اور بڑے معتز راویوں سے روایت ہے۔ ایک دفعہ پدر بزرگوار غور سے صورت دیکھ رہے تھے تو بزرگ مرتبہ دختر نے کہا کہ آج آپ بڑے غور سے علیؑ کا چہرہ دیکھ رہے ہیں۔ ایسا غیر معمولی استغراق تھا کہ دیکھنے والی خاتون کو تعجب ہوا کہ آج آپ بڑے غور سے علیؑ کا چہرہ دیکھ رہے ہیں۔ تو پدر بزرگوار نے یہ کہہ کر منہ بند کیا کہ تم نے رسولؐ کا یہ قول نہیں سنا کہ:

اَلنَّظْرُ عَلٰی وَجْہِ عَلِیٍّ عِبَادَۃٌ

''علیؑ کے چہرہ پر نظر کرنا عبادت ہے''۔

تو اب دنیا کی سمجھ میں نہ آئے کہ مخلوق کا ذکر کیونکہ عبادت اور مخلوق کے چہرہ پر نظر کیونکر عبادت؟ میں کہتا ہوں قرآن بھی خدا تو نہیں ہے، کلام خدا ہے۔ مگر اس کے حرفوں پر نظر عبادت ہے یا نہیں؟ اس کا تلاوت کرنا عبادت ہے یا نہیں؟ اس لئے کہ یہ لفظی تعلیمات کا مجموعہ ہے۔ تو جب اس کی تلاوت کریں گے تو تعلیمات الٰہی زبان پر آئیں گے۔ مقصد خدا پورا ہوگا۔ تو جو تعلیماتِ الٰہی کا مجموعہ ہو، اس کا پڑھنا عبادت ہو اس کا سننا عبادت ہو اور اس کے حروف پر نظر کرنا عبادت ہو۔ تو جو اس کی تعلیمات کا عملی مجسمہ ہو جائے، اس کا ذکر بھی عبادت ہوگا، ان کے ذکر کی مجلس میں بیٹھنا عبادت ہوگا، ذکر کو غور سے سننا عبادت ہوگا، اس کی سطور اور حروف پر نظر کرنا عبادت ہوگا، ان کے چہرہ کے خدوخال کو دیکھنا عبادت ہوگا کہ یہ اس کی تعلیمات کا مرقع ہیں۔

بحمد للہ! ہم اس حیثیت سے خوش نصیب ہیں کہ جب دل چاہتا ہے مجلس

کر لیتے ہیں ۔لیکن حسینؑ کو یاد کرنا جن کا حق تھا، ان کا دور ایسا تھا کہ وہ باپؑ کی مجلس نہیں کر سکتے تھے۔ دیکھنے میں تو سید الساجدین علیہ السلام کا قید خانہ تھوڑی مدت کا تھا، زیادہ سے زیادہ ایک سال، اس میں اختلاف ہے کہ اس سال رہائی ہوئی یا دوسرے سال مگر بہر حال ایک سال کے بعد قید ختم ہوگئی۔مگر میں تو سمجھتا ہوں کہ آزادی اس کے بعد بھی نصیب نہیں ہوئی۔ مجھے تو پوری زندگی قید خانہ میں نظر آرہی ہے ۔مگر انہوں نے اپنی ذات کو ان مقاصد کو پورا کرنے کا ذریعہ بنا لیا جن کو کھل کر انجام نہیں دے سکتے تھے۔

دور ایسا تھا کہ شاگرد جمع نہیں ہو سکتے ۔مجلسِ درس مرتب نہیں ہوسکتی تو اس کی تدبیر کیا کی کہ مناجات کو مدرسہ الٰہیات بنا دیا، دعاؤں کے ذریعہ سے۔ ہم کسی آدمی کو مخاطب کر ہی نہیں رہے کہ سیاست کا کوئی شکنجہ ہمیں کسے۔ ہم تو اپنے خدا کو مخاطب کر کے بات کہہ رہے ہیں۔لہٰذا کوئی سیاستِ وقت اس پر پہرے نہیں لگا سکتی ۔ یہ ہیں ان کے وارث جو سیاست نہیں جانتے تھے، سیاست نہیں برتتے تھے۔سیاست شکنی کرتے تھے۔اسی طرح اس سیاست کو شکست دے رہے ہیں مجلس بات کی نہیں کر سکتے تو اپنی ذات کو مجلس بنا دیا ہے۔

آبِ وضو سامنے آیا، اب کوئی ذاکر منبر پر نہیں ہے۔ یہ پانی ذاکر ہے۔ چلّو میں پانی جو آیا ہے، وہی حسینؑ کی یاد دلا رہا ہے، آنسو بہنے شروع ہو گئے۔ خاموش ذاکری اور اس کا اثر بھی خاموش ۔آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور اتنے آنسو کہ وہ پانی گویا آبِ مطلق کی بجائے آبِ مضاف ہوگیا۔اب اس سے وضو صحیح نہیں رہا تو اسے پھینک دیا۔ دوسرا چلّو لیا۔ یہ گویا دوسرا ذاکر ہوگیا۔ جب تک وضو نہ ہوجائے ،حسینؑ کی مجلس برپا ہے۔

بعض چیزیں ایسی ہیں کہ یوں کہی جائیں تو لوگ نہیں سمجھیں گے کہ پرنالے

سے پانی بہہ رہا ہے۔اب دیکھئے کہ حسینؑ کا ذکر بازار تک پہنچ رہا ہے،گلی تک پہنچ رہا ہے کہ وہ پانی آرہا ہے ۔کوئی دامن بچا رہا ہے ۔ کہنے والا کہتا ہے جو گھر سے نکلا ہے کہ ارے دامن نہ بچاؤ، یہ کوئی ویسا پانی نہیں ہے، یہ سید سجاد علیہ السلام کے آنسو ہیں۔ دیکھئے !ذکر متعدی ہوا، دوسرے تک پہنچا۔اگر یہ بے جھجک کہہ دیا جائے تو لوگ کہیں گے کہ اتنے آنسو کہاں بہ سکتے ہیں کہ وہ پرنالے سے بہیں ۔مگر اب آپ نے نوعیت سمجھی کہ وہ آب وضو ہوتا تھا جس کے ساتھ آنسو شریک ہوکر باہر جاتے تھے۔

تو وہ مبلغ بن گئے۔ وہ آنسو اب مبلغ بن گئے، چاہے آواز نہ جائے مگر خود آنسو دنیا تک پہنچ رہے ہیں۔ اب اسے اس مجبوری کا احساس ہوگا کہ اتنا اثر ہے اور پھر یہ مجلس نہیں کر سکتے ۔ شہاب الدین زہری ، یہ آئمہ حدیث میں ہیں اورعبدالملک بن مروان کے ہاں ان کی بڑی قدرومنزلت ہے۔ کثیر التعداد شاگردوں کے استاد ہیں ان سے احادیث پوچھی جاتی تھیں اور یہ حق کی بہت سی حقیقتوں سے واقف تھے ۔مگر چونکہ بادشاہ تک پہنچ تھی، تو آزادی کے ساتھ ان مفادات کو نظر انداز تو نہیں کر سکتے تھے،لہٰذا پھر بھی حسب مصلحت بیان کرتے تھے۔ بادشاہ نے ان سے پوچھا، اموی بادشاہ نے پوچھا کہ کیا آپ کے علم میں یہ ہے، سنا ہے کہ علی مرتضیٰؑ کے سر پر جب ضربت لگی ہے اور آپ کی وفات ہوئی ہے تو بیت المقدس میں جو پتھر اٹھایا گیا، اس کے نیچے سے خون ابلتا تھا؟ یہ روایت غالباً عام طور پر گوش زد نہیں ہوئی ہے کہ دمشق میں جہاں ناواقف رکھنے کی تربیت کی گئی تھی، وہاں یہ روایت پہنچ گئی تھی کہ حضرت علی علیہ السلام کی شہادت پر پتھروں کے نیچے سے خون ابل رہا تھا۔اس نے کہا کہ کیا آپ نے یہ بات سنی ہے؟ یہ بے جھجک نہیں بیان کرنا چاہتے تھے۔ اس نے کہا کہ میں نے سنا ہے، آپ سے تصدیق چاہتا ہوں۔انہوں نے کہا کہ بالکل صحیح ہے اور یہ روایت مجھ تک پہنچی ہے اور میں اس

کومعتبر سمجھتا ہوں ۔ بے شک ایسا ہوا ہے ۔

دیکھئے! اب کتنا ٹکراؤ ہے ضمیر میں اور سیاست میں کہ خود مشتاق ہو کر پوچھا اور تصدیق کروائی ۔ جب انہوں نے تصدیق کر دی تو کہا کہ اچھا! مجھے معلوم ہو گیا، اب اس کو لوگوں سے بیان نہ کیجئے گا ۔

دیکھا آپ نے کہ فضائل آلِ محمدؐ کس طرح مصلحت بینی کے پردوں میں چھپ کر ہم تک پہنچے ہیں!

مصائب

غرض یہ ایسے محدثین میں سے تھے کہ بادشاہِ وقت ان سے حدیثوں کی تصدیق چاہتے تھے، اب یہ آئے، دل کے کسی گوشے میں محبتِ اہلِ بیتؑ تھی، آئے اور امام زین العابدین علیہ السلام سے عرض کیا کہ میرے ہاں شادی ہے، تمنا ہے کہ آپ تشریف لائیں اور میری عزت افزائی فرمائیں ۔ دیکھئے اتنی اہم بات، آج تک اس کا اظہار نہیں ہوا تھا ۔ وہ واقعہ سے ظاہر ہے کہ یہ عرض کیا، انہوں نے جو یہ کہا تو گویا مجبور ہو کر امام زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا کہ بھائی! واقعہ کربلا کے بعد سے میں نے شادیوں میں شرکت ترک کر دی ہے ۔ اس جملہ میں اتنا درد ہے کہ میری زبان پر آیا تو آوازیں گریہ کی بلند ہوئیں، چہ جائیکہ صاحبِ عزا خود اپنی زبان پر یہ جملے لائے، اس میں اتنا سوز و گداز تھا کہ انہیں اصرار کی ہمت ہی نہیں ہوئی ۔ محل ہی باقی نہیں رہا کہ وہ اصرار کریں اور گویا دل کے اندر یہ جملے گھر کر گئے ۔ وہاں سے واپس ہوئے، میں سمجھتا ہوں کہ افسردہ دلی کے ساتھ، یہی تو فلسفہ عزا ہے کہ مسرت متعدی نہیں ہے، محلے میں گانا بجانا ہو رہا ہو تو جستجو نہیں پیدا ہو گی کہ کیا بات ہے لیکن اگر کسی گھر سے رونے کی آواز آجائے تو آپ کی فطرت مجبور ہو گی کہ دروازہ پر رُک کر

پوچھیں کہ کیا بات ہے یعنی اثر غم وہ ہے کہ غیر متعلّق کو متعلّق بنا دیتا ہے ۔

بس یہی فلسفہ عزا ہے، یہی کوشش انسدادِ عزا کا فلسفہ ہے ورنہ آنسو ہم بہاتے ہیں، تکلیف لوگوں کو ہوتی ہے، ہاتھ ہمارے سینوں پر پڑتے ہیں، دل دوسروں کا دکھتا ہے ۔ درحقیقت فلسفہ عزا بھی یہی ہے اور فلسفہ انسدادِ عزا بھی یہی ہے ۔

پس دل میں گھر کر گئی وہ بات اور افسردگی کے ساتھ یعنی خوشی شادی کی ذرا مغلوب ہو گئی، اعلان ہو چکا تھا، ظاہر ہے کہ شادی ہوئی مگر دل پر جو اثر ہو چکا تھا، تو کچھ عرصہ کے بعد جب وہ مصروفیات ختم ہوئیں تو امام علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اس دن میں نے گزارش کی تھی اور آپ نے ایسی بات فرمائی تھی کہ مجھے ہمت نہیں ہو سکتی تھی کہ میں مزید اصرار کرتا لیکن میری دلی تمنا ہے کہ آپ میرے گھر تشریف لائیں تو اب میں نے آپ کے والد بزرگوار کی مجلس عزا قائم کی ہے ۔ آپ اس میں تشریف لائیں ۔ آپ نے فرمایا: ہاں! اس میں ضرور آئیں گے ۔ ظاہر ہے کہ جب ماحول ایسا ہوا اور بادشاہ تک سے رابطہ ہو تو کتنی احتیاط سے سامعین کو چن چن کر اطلاع دی ہو گی، جو رازدار بھی ہوں اور اس گھر کے ساتھ خاص عقیدت بھی رکھتے ہوں ۔ وہ مجمع خاص افراد کا ہو اور امام وقتِ معین پر تشریف لائے ۔ انہوں نے امام کو صدرِ محفل میں جگہ دی، مجلس شروع ہوئی اور اب ذاکر منبر پر آ گیا ۔ یہ حقیقت ہے کہ ابتداء ذکرِ حسینؑ کی نظم سے ہوئی ۔ شاعر نے مرثیہ امام حسین علیہ السلام کا پڑھا ۔

میں کہتا ہوں کہ کبھی کبھی ذاکر مصائب میں یہ بیان کر دیتا ہے کہ مجلس میں حضرتِ سیدہ عالمؑ تشریف لاتی ہیں اور آپ کے ہاتھ میں رومال ہوتا ہے اور رونے والوں کے آنسوؤں کو خشک کرتی ہیں ۔ تو جب ذاکر یہ بیان کرتا ہے تو مجلس میں اثر پیدا ہو جاتا ہے ۔ یہ تو ایک ذاکر ہے جو بیان کرتا ہے، چہ جائیکہ صاحبِ عزا سامنے

موجود ہوں تو اب سامعین کے اثر کا عالم کیا ہوگا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ذکرِ مصیبت شروع ہوا تو کسی کو اتنا ہوش نہ رہا کہ کون کہاں بیٹھا ہے؟ جب ذاکر کا بیان ختم ہوا، انہوں نے سر اُٹھایا تو دیکھا کہ جہاں بٹھایا تھا، امامؑ وہاں تشریف نہیں رکھتے۔ پریشان ہوئے، گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا تو یہ دیکھا کہ جہاں لوگ جوتے اُتارتے ہیں، وہاں تشریف رکھتے ہیں۔ انہوں نے آکر قدموں پر سر رکھ دیا، کہا: مولا! میں نے تو آپ کو وہاں بٹھایا تھا، آپ یہاں کیوں تشریف لائے ہیں؟ فرمایا: تم تو اسی مجمع کو دیکھ رہے ہو جو تمہارے سامنے ہے، میں دیکھ رہا ہوں کہ کون کون یہاں موجود ہے؟ میری جگہ یہی ہے جہاں میں ہوں۔

دوسری مجلس

- میں کہتا ہوں کہ میں اس وقت جانوں کہ آپ واقعی باغی ہیں کہ جب وہ بھیجے تو آیئے نہیں اور جب وہ بلائے تو جایئے نہیں
- قلتِ عمل کو نہ دیکھ، کیفیتِ عمل کو دیکھو۔ اب حیرت نہیں ہونی چاہئے کہ ایک ضربت ہو اور اس کی عبادت ثقلین سے افضل قرار دے دیا جائے۔
- اسلام کے معنی یہ نہیں ہیں کہ عقل کو خیر باد کہہ دیا جائے بلکہ اسلام کی تعلیمات صاحبانِ عقل ہی کیلئے ہیں۔
- میں کہتا ہوں کہ یہ کتنی بڑی کم ظرفی ہے کہ اس کے دیئے ہوئے اختیار کو اس کی نافرمانی میں صرف کیا جائے۔
- اس کے ہاں یہ اعلان کہ اگر اطاعت کرو گے تو جزا دوں گا اور اگر معصیت کرو گے تو سزا دوں گا، یہ اس کا فضل و کرم نہیں ہے تو اور کیا ہے؟
- کربلا میں جو بھی شہید ہوا، اُس کی مادّی تکلیف اُسی وقت ختم ہوگئی لیکن جو زندہ رہا، وہ سخت تکلیف میں مبتلا رہا۔ گویا وہاں جینا مشکل اور مرنا آسان تھا۔ مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آسکی کہ مولا نے علی اصغر کو شہادت کیلئے کیوں رکھا، حالانکہ چھ ماہ کا بچہ بھوک و پیاس سے بِلک رہا تھا۔

اسلام اورادیان عالم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَمَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡہُ ۚ وَھُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴿۸۵﴾

(اور جو اسلام کے علاوہ کوئی دین تلاش کرے وہ اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں ہوگا۔)

خصوصیات اسلام موضوعِ بیان ہے۔ پہلی خصوصیت یہ ہے کہ جتنے دنیا کے مذاہب ہیں ان کی نسبت کسی شخص کی طرف ہے یا کسی سرزمین کی طرف ہے۔ جب نسبت کا مرکز محدود ہے تو وہ دین لامحدود کیونکر ہوسکتا ہے؟ جو اس مرکز سے تعلق نہ رکھتا ہو جس کی طرف اس کی نسبت ہے، وہ اس دین سے بے تعلقی کا بلاتکلف اعلان کرسکتا ہے۔ اسلام میں یہ خصوصیت ہے کہ اس کا تعلق کسی مخلوق کی ذات سے نہیں ہے۔ نہ کسی سرزمین سے اس کا تعلق ہے بلکہ اس کی اضافت اور اس کی نسبت خالق کائنات کی طرف ہے لہٰذا جو بھی خالق کی مخلوق ہو، اس کو دین سے لگاؤ ہونا چاہئے

میں نے کہا کہ اسلام کے معنی ہیں اطاعت اور سپردن، سرجھکادینا اطاعت کیلئے اور اپنے کو حوالے کردینا کسی کی اطاعت میں۔ تو اسلام ہوا سرجھکانا اللہ کی بارگاہ میں اور خود کو اللہ کے سپرد کردینا۔ اسلام کا براہ راست

تعلق اللہ کے ساتھ ہے۔ اب اسی سے دوسری خصوصیت وابستہ ہے جو آج عرض کرنی ہے۔ وہ خصوصیت سمیٹ کردو الفاظ میں یوں بیان ہوسکتی ہے کہ اسلام دین کائنات ہے جو معنی اسلام کے میں نے آپ کے سامنے عرض کئے تو عالمِ کائنات کا کونسا ذرہ ہے جو اس جوہر کا حامل نہ ہو۔ ثریٰ سے لے کر ثریا تک جو بھی چیز ہے، خواہ وہ زمین کے ذرے ہوں، خواہ وہ آسمان کے ستارے ہوں، سبھی خالق کی اطاعت میں سرگرم ہیں۔ اس حقیقت کو وہ جملہ نمایاں کرتا ہے جو نئے چاند کو مخاطب کرکے پڑھنا آپ کو سکھایا گیا ہے۔ دعائیں جو آئمہ معصومینؑ نے سکھائی ہیں، اس میں دین کے حقائق کو سمو دیا ہے۔ تو چاند کو مخاطب کرکے آپ کیا کہتے ہیں؟

اے وہ مخلوق! جو جان کھپائے ہوئے ہے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے میں۔ چاند کو مخاطب کرکے ان الفاظ میں پہلا ہی جملہ کہنا اجرام ساویہ کی عبادت کرنے پر ایک ضرب تھی کیونکہ دنیا والے خود انہیں معبود بنائے ہوئے تھے۔ خود انہیں مدبر کائنات کہہ رہے تھے، لہٰذا ہم انہی کے ایک نمائندہ فرد کو جو سال میں بارہ مرتبہ ہمارے سامنے ازسرنو آتا ہے، اس کو ہم مخاطب کرکے یہ کہتے ہیں کہ تو خود کوئی چیز نہیں ہے، تو کسی حاکم اور مدبر کے زیرفرمان ہے اور اس کے فرمان کے پورا کرنے میں تیری ہر حرکت اور ہر سکون ہے۔ تیرا طلوع ہے، تیرا غروب ہے۔ یعنی جس حقیقت کا اظہار حضرت ابراہیمؑ نے پورے مباحثہ میں کیا تھا، جس کا قرآن مجید میں تقریباً ایک صفحے کی آیات میں ذکر ہے، وہ معصومؑ نے اس جملے سے سمجھا دیا۔

کئی جملے ہیں جو برابر ان کی زبان پر آئے۔ پہلے سوال کیا، پھر نفی کی۔ وہ تذکرہ پورا قرآن مجید میں ہے جسے نافہموں نے کہہ دیا کہ (معاذاللہ) اتنی دفعہ جھوٹ بولے۔ جو بڑی سچائی کے دعویدار ہیں، وہ انبیاء پر بھی جھوٹ کا الزام لگاتے ہیں۔ تو ہم پر اگر تقیہ کے نام سے جھوٹ کا الزام لگائیں تو بڑی بات نہیں ہے۔ وہ

طولانی مباحثہ ہے اور چونکہ بہت سے لوگوں نے اس پر اعتراضات کئے ہیں اور اس کا تذکرہ آ گیا ہے تو مختصر حل بھی پیش کر دوں۔ ذکر یوں کیا ہے کہ انہوں نے ستارے کو دیکھا تو کہا هٰذَا رَبِّیْ ''یہ میرا پروردگار ہے''، جب غروب ہوا تو انہوں نے کہا کہ ایسا جو غروب ہوگیا، وہ خدا کہا ں ہوسکتا ہے؟ پھر چاند کو دکھا ،اس کو کہا ''هٰذَا رَبِّیْ''، ''یہ میرا پروردگار ہے''، جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا کہ میں ہرگز غروب ہونے والوں کو دوست نہیں رکھ سکتا۔

تیسری دفعہ سورج کو دیکھا تو کہا کہ یہ میرا پروردگار ہے، یہ سب سے بڑا ہے۔ جب وہ بھی غروب ہوگیا تو کہا کہ میرا اصل پروردگار میری ہدایت نہ کرے ،تو میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھاؤں؟ اسی سے ظاہر ہے کہ پروردگار کا تصور تو پہلے سے دماغ میں موجود تھا۔ اس کے بعد میں کہتا ہوں کہ اصل واقعہ پر ہر صاحب عقل غور کرے کہ اسلام کے معنی یہ نہیں ہیں کہ عقل کو خیر باد کہہ دے بلکہ اسلام کی تعلیمات صاحبانِ عقل کیلئے ہیں۔ اب ہر صاحب عقل غور کرے صورتِ واقعہ پر کہ ستارہ کو دیکھا اور کہا کہ یہ میرا پروردگار ہے۔ اور جھوٹ تو جب ہوگا، جب یہ واقعہ کسی خاص موقعہ پر پیش آیا ہو جو انہوں نے یہ کہا اور پھر یہ ہوا اور پھر یہ کہا۔

ہر صاحب عقل غور کرے کہ یہ ستارہ پرست ، یہ ماہتاب پرست ، یہ آفتاب پرست ۔ ان سب کی اس میں ردّ موجود ہے۔ کیا یہ بڑی کانفرنس ہوئی جس میں ستارہ پرست بھی تھے، ماہتات پرست بھی تھے، اور آفتاب پرست بھی تھے۔ انہوں نے پہلے ستارہ پرستوں کو مخاطب کرکے کہا، ستارہ کیلئے ،کہ یہ میرا پروردگار ہے تاکہ اب وہ متوجہ ہوجائیں لیکن جب وہ غروب ہوا،ستارہ طلوع ہوکر فوراً غروب نہیں ہوا، اس کے معنی یہ ہیں کہ پوری کانفرنس بیٹھی رہی کہ اب کیا کہیں گے۔ ظاہر ہے کہ شروع شب میں کہا تھا کہ یہ میرا رب ہے اور جب پوری

رات گزر گئی اور وہ ایسے تھے کہ اپنی رَد سننے کیلئے بیٹھے رہے۔ تب انہوں نے پچھلے پہر جب وہ ڈوبا تو یہ کہا کہ یہ تو ڈوب گیا۔ میں اس کو کیونکر مانوں؟ پھر بھی مجمع منتشر نہیں ہوا۔ وہ جمارہا کہ ابھی تو چاند کے بارے میں ان کا تبصرہ سننا ہے۔ اب چاند تو نہ جانے کتنے گھنٹے کے بعد نکلے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نہ انہوں نے کھانا کھایا، نہ پانی پیا، نہ جاکر سوئے۔ صرف حضرت ابراہیمؑ کی باتیں سننے کیلئے وہ پورا مجمع بیٹھا رہا اور جب چاند نکلا تو یہ بولے کہ یہ میرے پروردگار ہے اور مجمع اب بھی نہیں ہٹا۔ اس کے بعد بھی مشتاق رہا کہ یہ کیا کہتے ہیں؟ جب پوری رات گزر گئی یا آدھی رات، جتنی بھی گزری ہو، جس تاریخ کا چاند تھا، یہ کون جانے؟ لہٰذا جتنی دیر میں وہ ڈوبا ہو، اتنی دیر انتظار کیا اور ان سے سنا کہ میں ڈوبنے والوں کو دوست نہیں رکھتا اور پھر مجمع بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ سورج نکلے اور جب سورج نکلا تو انہوں نے کہا کہ یہ میرا پروردگار ہے، یہ سب میں بڑا ہے۔ تو اب وہ سب خوش ہوگئے جو آفتاب پرست تھے لیکن اب بھی نہیں اُٹھے۔

انہیں شوق ہے کہ یہ اس کے بعد کیا کہتے ہیں؟ اور جب سورج ڈوبا تو انہوں نے تبصرہ کیا۔ تو تین دن وہ مجمع بغیر کھائے پئے ان کے الفاظ کو سننے کیلئے بیٹھا رہا۔ تو کیا عقل اسے مانتی ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت خاص طور پر، یہ زبان پر آئے ہوئے الفاظ ہیں ہی نہیں، پوری عمر کا جو سفرِ تحقیق تھا، جن جن صورتوں سے انہوں نے ہر معبودِ باطل کو باطل کیا تھا، اسے خالق نے سمو کر ایک واقعہ کی شکل میں پیش کر دیا۔

یہ درحقیقت ان کے مباحثاتِ عمر کا خلاصہ ہے جس کو قرآن مجید نے سمو کر ایک واقعہ شکل میں پیش کیا ہے۔ اس کی نظیر میں پیش کر دوں کہ آلِ محمدؐ نے روٹیاں یتیم، مسکین اور اسیر کو دیں اور اس کے بیان کرنے کے بعد قرآن نے کہا ہے کہ ہم

نے تم کو صرف اللہ کی رضا کیلئے دیا ہے۔

لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا

نہ ہم تم سے کوئی جزا چاہتے ہیں، نہ کوئی شکریہ چاہتے ہیں اور ''مِنْكُمْ'' جمع کا صیغہ ہے ۔یعنی تم لوگوں کو ہم نے صرف اللہ کی رضا کیلئے دیا ہے، جزا اور شکریہ کیلئے نہیں ۔تو کیا یہ واقعی ان لوگوں سے انہوں نے کہا تھا؟

حضور والا! وہ یتیم و مسکن و اسیر کب ایک وقت میں آئے تھے جو اُن سے کہا جاتا کہ تم لوگوں کو ہم اللہ کی رضا کیلئے دے رہے ہیں۔ وہ تو یتیم ایک دن آیا تھا، مسکین ایک دن آیا تھا، اسیر ایک دن آیا تھا۔ وہ بحیثیت مجموعی کب تھے جو ان سے کہا گیا ہوتا؟ حقیقت یہ ہے کہ ہر دن کے دینے میں جوان کی نیت تھی، اسے اللہ نے قرآن بنا کر اتارا۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن کافی نہیں ہوتا، کم از کم عقل کی تو ضرورت ہوتی ہے۔ یہ جو چاند سے خطاب کر کے کہا جا رہا ہے، یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ تو خود مدبرِ عالم نہیں ہے، تو خود کوئی چیز نہیں ہے، درحقیقت کوئی حاکم ہے جس کے فرمان کے مطابق تو چل رہا ہے اور کائنات کی ہر شے یونہی اس کے فرمان کے مطابق چل رہی ہے۔ اس فرمان کی زنجیریں اتنی مستحکم ہیں کہ کبھی کوئی شے اس سے سرتابی نہیں کرسکتی۔ دنیا والوں نے بھی گاڑیوں کے اوقات مقرر کئے ہیں مگر وہ کتنی لیٹ ہوتی ہیں۔ خدا کی چلائی ہوئی گاڑیاں کبھی لیٹ تو ہو جائیں گے، جس تاریخ، جس لمحے پر انہیں طلوع ہونے کا حکم ہے، اس تاریخ، اسی وقت پر طلوع ہوں گے، اسی وقت پر غروب ہوں گے۔ کبھی اس نظام میں فرق نہیں پڑ سکتا۔ ہاں! وہی کسی کی خاطر نظام میں فرق ڈال دے۔۔۔۔

بحمد للہ! ممبر کے فیض سے آپ کو سب روایتیں یاد ہیں، لہٰذا مجھے صرف اشارہ کر دینا کافی ہے۔ میں کہتا ہوں یہی دکھانے کیلئے یہ نظام اتفاقاً نہیں ٹوٹا ہے، جس کی خاطر نظام توڑا گیا، اس نے دو رکعت نماز پڑھی، بارگاہ الٰہی میں دکھانے کیلئے ہاتھ اٹھائے کہ دیکھو! جس کا قائم کردہ نظام تھا، وہ آج بطور مستثنیات اسے توڑ رہا ہے۔

اس دعا کے الفاظ بھی عجیب وغریب ہیں ۔یعنی یہ نہیں کہتے، اپنی قرابت کا واسطہ دے کر کہ میرے بھائی کیلئے پلٹا دے ۔نہیں بارگاہ الٰہی میں عرض کر رہے ہیں کہ اگر یہ تیری اطاعت میں ہو۔قرآن مجید کہہ رہا ہے

خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَهَدٰى

''اللہ نے ہر چیز کو خلق کیا اور اس کی ہدایت کی''۔

یہ ہدایت کیا ہے؟ جتنی صلاحیت جس میں ہے، اس کو منزل کمال تک پہنچانا۔ اس کی منزلِ مقصود وہی ہے، اس کو اس منزل تک پہنچانا میں کہتا ہوں کہ ایک قطرۂ آب کو گہر ہونے کی منزل تک اور ایک ذرۂ خاک کو ثمر ہونے کی منزل تک، ایک تخم کو شجر ہونے کی منزل تک۔ یہ تمام منزلیں ہدایت ربانی کے ماتحت طے کرنا ہیں۔ وہ ہے جو اس کو اس منزل سے لے جا کر اس منزل تک پہنچاتا ہے۔ اس کا نام ہے ہدایت جسے کہا گیا ہے

خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَهَدٰى

مگر یہ تمام منزلیں ہدایت کی جو اس کی طرف سے طے ہوتی ہیں، یہ سب نظام تسخیری کے ماتحت ہوتی ہیں۔ یعنی اس کا کام منزل تک پہنچانا ہے، منزل کا بتانا نہیں ہے۔قطرہ گہر ہونے کی منزل تک اپنے ارادہ واختیار سے نہیں پہنچتا بلکہ

وہ پہنچاتا ہے۔ ذرہ ثمر اور بیج شجر کی منزل تک پہنچنے کا سفر خود سے طے نہیں کرتا بلکہ وہ اپنی طرف سے یہ منزلیں طے کرواتا ہے۔ نظام جبر کے ماتحت ہر چیز اپنی منزل پر پہنچتی ہے۔ انسان کو بھی اگر فاعل مجبور بنایا ہوتا تو پھر وہ تمام کائنات کی لائن میں ہوتا، اشرف المخلوقات نہ ہوتا۔ پھر درخت کی رفتار میں ذرہ کی رفتار میں اور اس انسان کی رفتار میں کوئی فرق نہ ہوتا۔ اس انسان کو اسے فاعل مختار بنانا تھا یعنی ایک دائرہ میں، جو اس کی حکمت کا تقاضا تھا، اتنا دائرہ جس کی وجہ سے اس کو کچھ فرائض کا ذمہ دار بنایا جاسکے، اتنے دائرہ میں اس کو خود اختیاری کا جوہر دیا گیا لیکن یہ خود اختیاری ایک دائرے میں اسیر ہے۔ جس وقت یہ اس خود اختیاری کا مالک بنا، تب بھی اس نظام ہدایت ربانی سے جو پتھروں پر جاری ہے، جو درختوں پر جاری ہے، جو جانوروں پر جاری ہے، اس سے پھر بھی آزاد نہیں ہوسکا۔ جس وقت سے دنیا میں آیا ہے، اس وقت سے اس نے اطاعت کرنا شروع کی۔ یہ اطاعت ویسی ہی ہے جیسی کائنات کی ہر شے اطاعت کر رہی ہے۔ اسی لئے اس وقت قلم احکام جاری نہیں ہوا یعنی ذمہ داریاں نہیں بنیں۔ اس بچے کو حکم نہیں ہے خالق کی طرف سے کہ تم غذا حاصل کرو۔ دوسرے جو اختیار کے مالک ہو چکے ہیں، ان کا فرض ہے کہ اس تک غذا پہنچائیں۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ عادل خدا جبر کی صورت میں احکام جاری نہیں کیا کرتا۔ اس کے بعد تو دنیا کی آنکھیں کھلتیں کہ وہ جبر کی قائل نہ ہوتی۔ میں کہتا ہوں کہ اگر بچے کو احکام سے مستثنٰی کر دیا ہے تو بڑوں کو بھی اگر مجبور بنایا ہوتا تو احکام کیوں جاری کرتا؟ یہ احکام کا جاری کرنا اختیار کی دلیل ہے اور پھر وہ بچہ تو نافرمانی نہیں کرتا، اس لئے کہ وہ نظام تسخیری میں اسیر ہے اور یہ جو بڑا ہو کر کوئی حق پورا کرتا ہے اور کوئی حکم پورا نہیں کرتا، اگر نظامِ جبر ہوتا تو مخالفت ہو ہی کیونکر سکتی۔ یاد رکھئے کہ

نافرمان کا وجود، دلیلِ اختیار ہے۔

وہ ہدایت ربانی جو پہاڑوں سے متعلق تھی، وہ ہدایت ربانی جو آسمان کے ہر سیارے سے متعلق تھی، وہ ہدایت ربانی جس وقت بچہ پیدا ہوا ہے، اس وقت بھی شامل حال ہے۔ یہ ابھی جز و کائنات ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ اگر وہ ہدایت شامل حال نہ ہوتی تو دنیا کی طاقتیں صرف ہو جاتیں اور ایک بچے کو غذا حاصل کرنا نہیں سکھا سکتی تھیں۔ اس لئے کہ سکھایا جاتا ہے دو طریقوں سے، ایک طریقہ لفظوں میں سکھانے کا ہے، ایک طریقہ اشاروں میں سکھانے کا ہے۔ لفظوں کے معنی وہی سمجھے گا جو اس کے معنی سے واقف ہو اور اشاروں کو وہی جانے گا جو قرارداد سے واقف ہو اور وہ جس نے مکتبہ وجود میں پہلا قدم رکھا ہو، جو نیا نیا کاشانہ امکان میں آیا ہو، وہ نہ کسی لفظ کے معنی سے واقف، نہ کسی اشارہ کی قرارداد سے واقف۔ اس لئے اسے غذا حاصل کرنے کا طریقہ سکھایا کیونکر جاسکتا ہے۔ اس کیلئے ضرورت اس معلم کی تھی جو سکھانے میں زبان و دہن کا محتاج نہ ہو، جو جسم اور جسمانیات سے بری ہو یعنی وہ جو کانوں سے اپنا ربط قائم نہ کرے بلکہ براہ راست دل و دماغ سے ربط قائم کرے۔ اس کی طرف کی تعلیم ہوسکتی ہے جو اسے پہلی غذا حاصل کرنا سکھائے ۔ وہ جتنا جتنا آگے بڑھتا ہے اور منزل شباب سے قریب آتا جاتا ہے، وہ سب منزلیں اس نظام ہدایت جبری سے طے ہو رہی ہیں۔ بچہ بڑا خوش ہوا اگر کسی صورت سے وہ بچہ ہی رہے مگر اس کا باہوش ہونا اس کے اختیار میں نہیں ہے۔ جب تک کوئی اور چاہے گا تب تک بیہوش رہے گا اور جب وہ چاہے گا تو اس کی ہوش کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ بچہ چاہے کہ میں قوت تمیز سے عاری رہوں تو قوت تمیز سے عاری نہیں رہ سکتا مگر گھر والوں یا ماحول کی بدتمیزی سے بدتمیز رہے، یہ اور بات ہے۔ یہ تمیز اور معنی میں ہے۔ اسی طرح سے وہ چاہے کہ میں ہمیشہ نابالغ رہوں یہ نہیں

ہوسکتا۔ جب منزل بلوغ آئے گی تو چاہے یا نہ چاہے، وہ بہرحال بلوغ کی منزل پر آنے کے بعد نوجوان ہوگا، پھر جوان ہوگا۔

سب منزلیں غیر اختیاری طور پر طے ہوں گی جس میں اس ارادے کا کوئی دخل نہیں ہے۔ جتنا جتنا ہوش بڑھتا جائے گا، جتنی جتنی صلاحیتِ صرفِ اختیار پیدا ہوتی جائے گی، اتنا اتنا اس کا دستِ جبر سمٹتا جائے گا اور اسے اختیار کے جوہر سے کام کرنے کیلئے موقع فراہم کیا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب اس کے نظامِ حکمت میں یہ اس قابل ہوگیا کہ وہ اپنے شعور کا مالک بن جائے اور اپنے شعور سے کام لے سکے تو اس وقت نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اب اس کیلئے خطِ تکلیف کھینچا گیا اور اب اس وقت سے حلال وحرم کی پابندیاں اس پر عائد ہوگئیں۔ اس کے بعد سے نظامِ تکلیف میں ہوا اب اسیر ہوگیا یعنی اب اللہ کی براہِ رست ہدایت کے دائرے سے نکل کر انبیاء کی ہدایت کے دائرہ میں آ گیا۔ جب تک اس کا نظام جبر کارفرما رہا، اس وقت تک کسی نبی کی ضرورت نہیں ہوئی، کسی رسول کی ضرورت نہیں ہوئی کہ وہ نبی آکر اسے یہ بتائے کہ تم کو غذایوں حاصل کرنا چاہئے یا رسول آکر حکم دیتے کہ تم ایسا کرو۔ اس وقت تک وہ اللہ کی ہدایت کا دل ودماغ سے رابطہ کافی تھا۔ لیکن اس وقت جب ہوش آیا تو اس کا فرض اور اس کی ذمہ داری منزل تک پہنچانے کی نہیں رہی بلکہ منزل کے بتانے کی ہوگئی۔ جب تک پہنچانا تھا، اس کا ارادہ ''کُن'' کافی ہوا، جس وقت بتانے کی منزل آئی تو اب عاجزی کی وجہ سے عدم امکان نہیں بلکہ بتقاضائے کمال خود اس کیلئے آکر منزل بتانا ناممکن ہوگیا کیونکہ یہ جسمانی آلائشوں میں اسیر اور وہ جسم وجسمانیات سے بری۔ اس لئے اب اس کو بتانے کیلئے خود آکر راستہ چلے، وہ خود آکر اشارے کرے کہ ادھر چلو، یہ ناممکن ہوگیا۔ یہ اس کی ربوبیت کے خلاف ہوگیا۔

لہٰذا اب ضرورت ہوئی کسی بیچ میں آنے والے کی۔ جب تک نظام جبر کار فرما رہا۔ اب جو الفاظ کہہ رہا ہوں، چونکہ حقیقت کی روشنی میں کہہ رہا ہوں، اس لئے الفاظ سے کوئی نہ گھبرائے۔ ممکن ہے اس کیلئے غیر مانوس الفاظ ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ جب تک نظامِ جبر کارفرما رہا، تب تک وہ کافی رہا اور اب جس وقت سے مقام ہدایت میں قول وعمل کی ضرورت ہوگئی، نمونہ بننے کی ضرورت ہوگئی، مثال قائم کرنے کی ضرورت ہوگئی تو اب رسول کی ضرورت ہوئی۔ تو اب کہئے، نہ گھبرائیے کہ وہ کافی نہیں ہوا اور جب وہ کافی نہیں ہوا تو اس کی کتاب کیا کافی ہوگی؟ اب جتنے دائرے میں اس نے اختیار دیا، اتنے دائرہ میں پابندیاں عائد ہوئیں اور ان پابندیوں کے بتانے کیلئے رسول کے اقوال ضروری ہوئے اور پابندیوں کے برتنے کیلئے نمونہ بن کر اس کے سامنے مثالیں قائم کرنے کی ضرورت ہوئی۔ اس کیلئے معلموں کا سلسلہ جاری ہوا۔ لیکن جس وقت اس کو قانون کا پابند بنا دیا گیا اور اب اس کو رہنمائی کی زنجیروں میں اسیر کر دیا گیا تو اس وقت بھی وہ بالکل خودمختار نہیں ہوا، اس وقت بھی یہ نہیں ہے کہ بالکل اس کو مطلق العنان چھوڑ دیا گیا کہ جو جی چاہے کرے۔ جی نہیں! جس دائرہ میں اسے اختیار دیا گیا ہے، اس دائرہ میں خودمختار ہے لیکن یہ کہ اپنے خون کی گردش پر اسے اختیار نہیں، اپنے دل کی دھڑکنوں پر اسے اختیار نہیں، اپنی نبض کی جنبشوں پر اسے اختیار نہیں۔

اب تو دنیا معنی سمجھی کہ نہ جبر ہے، نہ اختیار ہے۔ درمیان کی منزل ہے۔ یہ ہی تو معصوم نے بیان کیا تھا۔ چونکہ یہ اختیار کی منزل ہے، اس لئے مذہب کا نام آیا۔ دنیا والوں نے کہا کہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا، ہم نہیں مانتے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مذہب جس کی طرف سے ہوتا ہے۔ یعنی خدا، اسی کو ہم نہیں مانتے۔ میں کہتا ہوں کہ زبان اس نے آپ کے منہ میں دے رکھی ہے، لہٰذا کہہ دیجئے کہ مانتا ہوں یا نہیں

مانتا۔ آپ کی زبان ہے، آپ کو اختیار ہے۔ لیکن وہ اس زبان کو خاموش کر دے تو بات تو کر لیجئے۔ ہاتھ آپ کے قبضے میں دے رکھے ہیں، چاہے اس سے ڈوبتے کو بچایئے اور گرتے کو سنبھالئے اور چاہے اس سے کسی یتیم کو طمانچہ مار دیجئے۔ وہ ہاتھ آپ کے اختیار میں دیئے گئے ہیں۔ لیکن وہ اس ہاتھ کو شل کر دے تو حرکت تو ذرا دیجئے۔ پیر آپ کے قبضہ میں دیئے گئے ہیں، آپ ان پیروں سے خواہ مسجد کی طرف آیئے، خواہ مے خانہ کی طرف جایئے۔ لیکن وہ ان پیروں کو بے حس و حرکت کر دے تو جنبش تو دے کر دیکھئے، جتنے دائرہ میں اس نے جتنے عرصہ تک اختیار دے رکھا ہے، میں کہتا ہوں کہ یہ کتنی بڑی کم ظرفی ہے کہ اس کے دیئے ہوئے اختیار کو کسی نافرمانی میں صرف کیا جائے۔

انسان اگر اطاعت کرے تو ایک وفادار بندہ ہے، اطاعت نہ کرے تو نافرمان۔ لیکن جتنی اطاعت اسے لینی ہوگی، وہ تو لے ہی لے گا۔ ایک وقت تھا کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے سامنے خدا کا ذکر آیا اور انہوں نے کہا کہ ہماری تو سمجھ میں خدا کا وجود نہیں آتا حالانکہ دل کے اندر نہ اقرار ہے، نہ انکار ہے۔ مگر جیسے ایک فیشن ہے اور ترقی یافتہ ہونے کی علامت ہے۔ میری سمجھ میں خدا کا وجود نہیں آیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ میں بڑا فلسفی ہوں۔ یہ گویا فلسفی ہونے کا مظاہرہ ہے۔ یہ کہہ رہا ہے کہ میں نہیں جانتا، میں نہیں مانتا۔ یہ بھی ایک وضع ہے، ایک طبقے میں بغاوت بڑے فخر کی بات ہے سماج سے بغاوت، روایاتِ خاندانی سے بغاوت۔ ایسے لوگوں کے حالات میں لکھا جاتا ہے جو ابتدائے عمر سے باغی پیدا ہوا تھا، گویا بڑے صفِ اول کے انسانوں میں تھا کہ وہ شروع سے باغی پیدا ہوا تھا۔

تو سماج سے بغاوت، روایات خاندانی سے بغاوت، ماں باپ تک سے بغاوت، سب سے اعلیٰ قسم، خدا سے بھی بغاوت۔ کوئی ایسا باغی میرے سامنے آئے

تو میں اس سے کہوں گا کہ مبارک ہو، آپ باغی ہیں اور اس پر سب سے بڑا فخر ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ میں اس وقت جانوں کہ آپ واقعی باغی ہیں کہ جب وہ بھیجے تو آیئے نہیں اور جب وہ بلائے تو جایئے نہیں۔ حالانکہ کتنے بڑے باغی ہوں، جب اس نے بھجا، تب آئے اور جب وہ بلائے گا تو چلے جائیں گے۔ ممکن ہے کہ کہیں، جس وقت آئے تھے، اس وقت شعور بغاوت نہیں تھا مگر اب تو ماشاءاللہ پَرِ پرواز پیدا ہو گئے۔ اب تو عالم بالا میں آپ کی ترقی پہنچ چکی ہے۔ صاحب! جب بلائے تو جایئے نہیں، مگر میں دیکھتا ہوں کہ جب آئے تھے تو کم سے کم روئے تھے اور جب جائیں گے، تب سانس بھی نہیں لیں گے۔ چپکے سے چلے جائیں گے، یہ اس انسان ضعیف البیان کا دعوائے بغاوت ہے جس سے وہ کلاہِ فخر آسمان پر اچھال رہا ہے۔ ایک ملک والوں نے کہا کہ ہم نے خدا کو اپنے ملک سے نکال دیا ہے۔ خوب! آپ کے منہ میں زبان اس نے دے رکھی ہے تو جتنے زور سے نعرہ لگا سکتے ہیں، لگایئے کہ ہم نے نکال دیا ہے۔ لیکن آپ نے نکالا تو وہ نکل بھی گیا؟ یہ تو آپ کہہ رہے ہیں کہ نکل گیا لیکن اب تقریباً ایک صدی ہونے کے بعد بھی اب نہیں احساس ہوا کہ واقعی نکلا نہیں تھا، لے جا کر مشاہدین کو دکھلاتے ہیں کہ دیکھو! ہمارے ہاں مسجدیں آباد ہیں، دیکھو! ہمارے ہاں قرآن کے ایڈیشن چھپ رہے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہ تو اب معلوم ہوا کہ جو کارنامہ تھا، اس پر شرمانے لگے۔ اب اپنی صفائی پیش کرنے لگے کہ گویا وہ جرم تھا جو پہلے نعرے لگا رہے تھے۔ یہ انسان خدا کے مقابلہ میں دعوائے بغاوت کیا کرے گا۔ مگر ایک سوال میرے سامنے تازہ پیش ہو سکتا ہے کہ جب آپ کہہ رہے ہیں کہ بہرحال اس کی اطاعت کرنا ہے اور بغاوت ہو ہی نہیں سکتی تو پھر یہ اسلام کا مطالبہ کیوں ہے؟ پھر یہ انبیاء کیوں کہہ رہے ہیں کہ اسلام لاؤ، اسلام لاؤ، جب آپ کہتے ہیں کہ اسلام کائنات کا دین ہے

،یعنی ہم سے مطالبہ وہی ہے جو کائنات کی ہر شے کر رہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کوئی یہ کہے کہ جب ایسا ہے تو پھر آپ تبلیغ کیا کر رہے ہیں؟ آپ دعوت کیوں دے رہے ہیں؟ انبیاء کیوں آ رہے ہیں؟ وہ کیوں کہہ رہے ہیں کہ اسلام لاؤ۔

تو بس ایک جملہ کافی ہے، کسی بڑی منطقی تقریر کی ضرورت نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ انبیاء صرف اس لئے آ رہے ہیں کہ جس کی اطاعت جبری طور پر کرنا ہی ہے ، اس کی اطاعت اختیار سے بھی کرلو تا کہ تمہاری شرافت نمودار ہو۔ ورنہ اگر اختیاری اطاعت نہ کرو گے تو جتنی جبری اطاعت اسے لینا ہے، وہ تو وہ لے ہی لے گا۔ بس فرق یہ ہوگا کہ اگر اختیاری اطاعت کرو تو ثواب کا حق ہوگا اور اگر جبری اطاعت کرو گے تو ثواب کا حق نہیں ہوگا۔ پھر جزا کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

اب میں کہتا ہوں کہ جزا کا اعلان بھی صرف اس کا کرم اور تفضّل ہے، ورنہ یہ دنیا کی حکومتیں جنہیں ذاتی طور پر حکومت کا حق کوئی نہیں ہے، صرف آپس کے سمجھوتے سے حکومت ہے۔ صرف اپنی قرارداد سے حکومت ہے، ذاتی حقِ حکومت دنیا کی کسی حکومت کو نہیں ہے جب تک کہ وہ حقِ حکومت نہ دے۔ تو یہ دنیا کی حکومتوں کے ہاں نافرمانی کی سزا تو ہے لیکن فرمانبرداری کی جزا کوئی نہیں ہے۔ ایک دفعہ قانون شکنی کریں تو جیل پہنچ جائیں لیکن عمر بھر اگر قانون پر عمل کریں تو اس کیلئے جزا کوئی نہیں کہیں گے کہ وہ تو رعایا ہونے کا تقاضا ہی تھا۔ تو جنہیں ذاتاً حقِ حکومت ہی نہیں، وہاں تو فرمانبرداری کی کوئی جزا نہ ہو اور جو اپنے احسانات کے ذریعہ سے ،اپنے خالق ہونے کی وجہ سے، اپنے مالک ہونے کی وجہ سے، اپنے رب ہونے کی وجہ سے، ہر حیثیت سے حقِ حکومت رکھتا ہے، اس کے ہاں یہ اعلان کہ اگر اطاعت کرو گے تو جزا دوں گا اور اگر معصیت کرو گے تو سزا دوں گا۔ یہ اس کا فضل و کرم نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

میں کہتا ہوں کہ وہ سزا کا جو اعلان ہے، نافرمانی کی صورت میں، وہ اعلان ٹل بھی سکتا ہے لیکن جزا کا اعلان ٹل نہیں سکتا۔ ایک اور فرق عرض کرتا ہوں قرآن مجید کی روشنی میں کہ سزا مقدار عمل سے زیادہ نہیں ہوسکتی لیکن جزا کیلئے کم سے کم اعلان دس گنا کا ہے:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا

کم سے کم دس گنا کا اعلان اور زیادہ کی کوئی حد نہیں، یہاں تک کہ جو خیر خیرات میں دیا جائے، اس کیلئے تو کہا:

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ

مثال ان لوگوں کی جو اپنا مال خدا کی راہ میں صرف کرتے ہیں، غلے کے ایک دانے کی ہے جس سے سات بالیاں اُگیں اور ہر بالی میں سو دانے ہیں۔

تو کیا ہوا؟ سات سو گنا کا اعلان، مگر ابھی عطا کرنے والے کا دل نہیں بھرا۔ وہ کہتا ہے:

وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ

جس کیلئے چاہتا ہے، وہ اور اضافہ کرتا ہے۔ اب اور زیادہ کی حد نہیں بتائی۔

میں کہتا ہوں کہ جس کیلئے چاہتا ہے اور عطا کرتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ

اور عطا کرتا ہے۔اس کی کوئی حد نہیں بتائی۔جس کیلئے چاہا، اتنا دیا اور جس کیلئے چاہا، اور زیادہ دے دیا۔ جی نہیں! وہ کیفیات عمل دیکھتا ہے۔ وہ ظرف مکان وزمان کی خصوصیات دیکھتا ہے۔ ایک کے پاس ایک لاکھ تھے، سائل آیا اور اس نے ایک ہزار دے دیئے۔تو دیئے بہت لیکن ایک لاکھ میں سے ایک ہزار دیئے نا۔کسی کے پاس ایک صرف ایک پیسہ ہو اور سائل کو وہ ایک پیسہ دے دے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ پورا سرمایہ اس نے دے دیا۔تو قلتِ عمل کو نہ دیکھو، کیفیت عمل کو دیکھو۔ اب حیرت نہ ہونی چاہئے کہ ایک ضربت ہو اور اس کی عبادت ثقلین سے افضل قرار دے دیا جائے۔

یہ تقریر میں نے اپنے دل سے نہیں کی ہے۔ ایک لفظ قرآن مجید کا ہماری رہنمائی کر رہا ہے کہ یہ آخر کے جملے محض زینت آیت کیلئے نہیں آئے کہ کلام ناتمام رہا جاتا ہے، تو کچھ نہ کچھ آنا چاہئے۔اس میں بڑی حقیقتیں مضمر ہوتی ہیں۔ارشاد تھا:

وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ

''جس کیلئے چاہتا ہے اور دیتا ہے''۔

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ

''اور اللہ سمائی والا ہے''۔یعنی اس کا خزانہ کم ہونے والا نہیں، اس کے ہاں قدرت ختم ہونے والی نہیں۔اور ''علیم'' وہ جانتا ہے کہ مقدار استحقاق اس کی کیا ہے۔

یہ تو اس کی نظر، پسِ منظر اور خصوصیات ہیں۔ تین روٹیاں دی گئی ہیں، روزے رکھ کے۔ کردار اتنا ہے، ہر روز دل میں یہ تھا۔اگرچہ زبان سے کچھ نہ کہا۔ ہر روز یہ تھا کہ نہ تم سے جزا چاہتے ہیں اور نہ شکریہ چاہتے ہیں۔ وہ بھلا جزا کیا دیتے

اور شکریہ کیا ادا کرتے۔مگر جو نیت سے واقف تھے، اس میں دو جزو تھے، جزا بھی اور شکریہ بھی۔لہٰذا جب کردار کا بیان ہو چکا تو جتنی نعیم جنت تھی، سب سمیٹ کر ایک ایک کر کے بیان کر دی گئی کہ ایسے قصر اور ایسے محل اور پینے کیلئے ایسے ساغر اور جام اور ایسے خادم، سب کائناتِ جنت سمیٹ کر پیش کر دی گئی۔مگر نگاہ عادل نے ترازوئے عدل میں دیکھا کہ پلڑا عمل کا ابھی گراں ہے۔مگر کائناتِ بہشت تو سب سمیٹ کر آ گئی۔تو اب ارشاد ہوا:

اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً

اگر بالکل جزا ہو گئی ہوتی تو عربی کے لحاظ سے مجھے معلوم ہے کہ ہونا چاہئے تھا:

اِنَّ هٰذَا جَزَآءُكُمْ

یہ تو تمہاری جزا ہے۔ ہم سمجھتے ہو گئی جزا، مگر وہ جملے کو بڑھاتا ہے۔ الفاظ زائد صرف کرنا بے ضرورت ہے خلاف بلاغت ہے۔''اِنَّ هٰذَا جَزَآءُكُمْ'' نہیں کہتا جس کا مطلب ہے کہ یہ تمہاری جزا ہے۔وہ کہتا ہے ''اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً''۔

ارے یہ سب تو میں نے دے دیا مگر یہ تو تمہاری کچھ جزا ہوئی۔ یہ تو تمہاری تھوڑی سی جزا ہوئی۔تو اب کیا نگاہِ عادل عمل کو بے جزا رہنے دے؟ ادھر جزا تو ختم ہو گئی اور تھوڑی سی جزا ہوئی۔تو اب پلڑے میں شکر کو رکھنا چاہتا ہے کہ:

كَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا

''تمہاری سعی شکر کے قابل ہے''۔

مصائب

بہت اہم ہیں کربلا کے یہ تین دن! میں کیا کروں، وحی کا دروازہ بند ہو چکا، کوئی آیت نہیں دکھا سکتا، کوئی پورا سورہ نہیں دکھا سکتا، یہاں جزا کا ذکر کرنا ہی نہیں ہے، یہاں تو بس یہ کہہ دیا کہ اے نفسِ مطمئنہ! بس آ، جنت موجود ہے، داخل ہو اور جنت تیرے لئے کچھ تھوڑی ہے، تُو ہم سے خوش ہے، ہم تجھ سے خوش ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ تین دن کی جو پیاس ہے، اس میں غور کیجئے کہ سب سے زیادہ تشنہ لب کون ہے؟ کربلا میں پیاس کی سب سے زیادہ خصوصیت یہ ہے کہ جو زیادہ وقت تک زندہ رہا، وہ زیادہ پیاسا رہا، اسی لئے ہر جہاد میں عزیز آگے بھیجے جاتے تھے۔

اصحاب پیچھے رکھے جاتے تھے مگر کربلا کی منزل میں یہ ہوا کہ اصحاب پہلے گئے، عزیز بعد میں گئے۔ ممکن ہے کسی ذاکر سے آپ نے سنا ہو کہ عزیزوں نے جانا چاہا ہو اور اصحاب نے قدموں پر سر رکھ دیئے ہوں کہ ہم نہیں جانے دیں گے، ہم اپنے گلے کاٹ ڈالیں گے۔ لیکن میں آپ سے اپنے مطالعہ کی قوت پر یہ عرض کرتا ہوں کہ کربلا کے اقدامات تکلفات کے ماتحت نہیں ہو رہے تھے، میرا علم بھی یہی ہے اور میرا عقیدہ بھی یہی ہے کہ کربلا کے اقدامات ایک مقررہ نظام کے تحت ہو رہے تھے۔ ہرگز یہ نہیں ہے کہ عزیزوں نے جانا چاہا ہو اور اصحاب نے روکا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ مولاؑ نے حکم دے کر کہا تھا کہ خبردار! جب تک اصحاب میں سے کوئی ایک بھی ہے، کوئی عزیز آگے قدم نہ بڑھائے۔ میں کہتا ہوں گویا مولا نے کہا: علی اکبرؑ یہ تو نہیں ہوسکتا کہ تم حوضِ کوثر پر جا کر سیراب ہو جاؤ اور میرا حبیب پیاسا رہے۔ قاسمؑ تم کم سن سہی لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ تم اپنی پیاس بجھا لو اور میرے

بوڑھے اصحاب تشنہ لب رہیں۔ اب اس نظام کی تائید میں مَیں واقعہ پیش کرتا ہوں۔ اصحاب میں سے جو نو وارد ہے، وہ سب سے پہلے چلا جائے۔ حُر کو پہلے بھیج دیا۔ خاص الخاص اصحاب دو پہر تک ہیں۔ حبیب ابن مظاہر ظہر تک ہیں اور مسلم ابن عوسجہ بعد تک ہیں۔ حضورِ والا! حُر کو پہلے بھیج دیا۔ امام کے پیش نظر یہ ہے کہ جب دشمنوں کی فوج کا سردار ہو کر آیا، تب تو ہم نے پانی پلا دیا اور اب اپنا دوست ہو کر آیا ہے تو ایک جرعۂ آب نہیں۔ تو اگر پانی نہیں پلا سکتے تو پیاسا کیوں رکھیں؟ لہٰذا ابھی آئے ہو، ابھی جاؤ۔

خاص الخاص اصحاب دو پہر تک ہیں۔ اس کے بعد فرزندانِ مسلم پہلے چلے جائیں۔ فرزندانِ جعفر پہلے چلے جائیں۔ عباس ایسا بھائی بعد میں جائے اور برابر کا بیٹا، کڑیل جوان بعد میں جائے۔ اب کچھ آپ نے سمجھا کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کی قوتِ برداشت پر بھروسہ زیادہ ہے اور جس سے مصیبت کا مقابلہ زیادہ کروانا ہے، اُسے آخر کیلئے رکھا گیا ہے۔

مگر مولا کی خدمت میں دست بستہ عرض کروں گا کہ یہاں تک میری منطق نے ساتھ دیا، یہاں تک میرے فلسفہ نے مدد کی مگر مولا! اب میری منطق جواب دے گئی ہے کہ اب میں اس کا فلسفہ نہیں بتا سکتا کہ یہ عباسؑ کے بعد، علی اکبرؑ کے بعد، یہ چھ مہینے کی جان، آپ نے حضرت علیؑ اصغر کو تو بس اپنا پیش خیمہ رکھا۔ اس کے بعد جو کہنا ہے، اس کا تتمہ یہ ہے کہ بہتر (۷۲)، سب پیاسے ہیں۔ مگر سب سے زیادہ تشنہ لب ہمارے امام حسین علیہ السلام۔ اس لئے سب پیاسے ہیں مگر مرثیہ جب بھی پڑھا گیا، حسینؑ کی پیاس کا، سید سجادؑ نے بھی کہا: میرے بابا دنیا سے پیاسے گئے، زینبؑ نے کہا: میرا بھائی دنیا سے پیاسا گیا، رباب نے بھی یہی پوچھا کہ کیا میرے سرتاج کو پانی ملا؟ میں کہتا ہوں کہ پھر بھی مولا کی پیاس کی حد عصر عاشور، وہی جس

کے بعد ہم اور آپ لوگ فاقہ شکنی کرتے ہیں۔اب مولاؑ کی پیاس ختم ہوگئی ہے مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ زینب کب تک پیاسی رہیں؟ علی اصغر کی پیاس کی حد بتا سکتا ہوں مگر سکینہ کب تک پیاسی رہیں؟۔۔۔۔

تیسری مجلس

- بشر وہ نہ سمجھو جس پر وحی نہ ہو سکتی ہو بلکہ تصور کرو کہ بشر ہو سکتا ہے جس پر وحی ہوتی ہے۔
- میں کہتا ہوں کہ انسان انہی کا صدقہ ہے کہ جو اس کو احسن ہونے کی سند ملی ہے ورنہ کیا ان آدمیوں کے لحاظ سے یہ سند ملی ہے جو کیڑوں مکوڑوں سے بدتر ہیں۔
- معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اپنی اس مخلوق پر اتنا ناز ہے کہ اس کے تذکرے میں گویا کہنے والے کو لذت محسوس ہو رہی ہے۔
- خالق کو اپنی بہترین مخلوق پر ناز ہے کہ سب اجزا بتا رہا ہے کہ اب سب بتا دیا ہے، بنا سکو تو بنا لو۔
- اب محسوس ہوتا ہے جیسے صنعت کا بنانے والا صناع اس تذکرہ سے جھوم گیا۔ اس نے کہا: ''فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ'' ارے! کیا کہنا اس اللہ کا جو بہترین خالق ہے۔

اسلام اور ادیانِ عالم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"وَمَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡہُ وَھُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ"۔

(اور جو اسلام کے علاوہ کوئی دین تلاش کرے وہ اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں ہوگا۔)

جو اسلام کے علاوہ کوئی دین اختیار کرے، وہ ہرگز قبول نہیں ہوگا اور وہ آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔ خصوصیاتِ اسلام میں سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا تعلق کسی شخص یا جگہ سے نہیں ہے بلکہ خالق کائنات سے تعلق ہے۔ اس لئے اس کے نام میں بھی ہمہ گیری ہے اور کام میں بھی ہمہ گیری ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ دینِ کائنات ہے، دینِ فطرت ہے۔ فطرت کے علاوہ کوئی بار انسان پر ڈالنا مقصود نہیں ہے۔ جو کچھ وہ فطری طور پر، غیر اختیاری طور پر کر رہا ہے، اسی کو اختیاری طور پر کرنے کا مطالبہ ہے۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ انسان کو اسلام نے انسانیت شناسی کا تحفہ دیا۔ اسلام سے الگ ہٹ کر دنیا نے پہچانا ہی نہیں تھا کہ انسان کیا چیز ہے۔ اس کے نہ پہچاننے کی وجہ سے وہ طرح طرح کی گمراہیوں میں مبتلا ہوا۔ عقیدہ کے اعتبار سے بھی اور عمل کے اعتبار سے بھی، ابتداء میں بھی، انتہا میں بھی۔ یعنی پرستش کا مرکز بھی پست قرار دیا اور قربانی کا مرکز بھی

پست قرار دیا۔ یہ سب انسان ناشناسی کا نتیجہ تھا۔ انسان نے انسانیت کو بہت پست سمجھا اور انسان ہونا اپنے لئے گویا بڑی ذلیل بات سمجھا۔ لہٰذا انبیاء ومرسلین کیلئے یہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک انسان کیونکر نبی اور رسول ہوسکتا ہے؟ قرآن مجید کا ہم شروع سے آخر تک مطالعہ کرتے ہیں تو کفار اور مشرکین کا سب سے بڑا استدلال انبیاء کے مقابلہ میں یہ رہا کہ آپ بشر ہیں تو ہم کیونکر مانیں کہ آپ نبی اور رسول ہیں۔ اسی کو وہ طرح طرح سے کہتے تھے۔ کبھی کہتے تھے:

"مَا ھٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ یَاۡکُلُ مِمَّا تَاۡکُلُوۡنَ وَ یَشۡرَبُ مِمَّا تَشۡرَبُوۡنَ"۔

اس کو کیونکر مانیں، یہ تو تمہارا ایسا ایک آدمی ہے، جو غذائیں تم کھاتے ہو، وہ یہ بھی کھاتا ہے، جو پانی تم پیتے ہو، جس طرح پیتے ہو، اسی طرح وہی پانی بھی پیتا ہے۔ اس میں کیا خاص بات ہے جو اسے مانیں؟ کہیں کہ کہتے تھے:

"وَقَالُوۡا مَالِ ھٰذَا الرَّسُوۡلِ یَاۡکُلُ الطَّعَامَ وَیَمۡشِیۡ فِی الۡاَسۡوَاقِ"۔

ارے یہ رسول کیسا ہے جو کھانا کھاتا ہے اور ہماری طرح سڑکوں پر بازاروں میں پھرتا ہے۔

کہیں یوں کہا، جب موسیٰ وہارون آئے تو:

"فَقَالُوۡآ اَنُؤۡمِنُ لِبَشَرَیۡنِ مِثۡلِنَا وَ قَوۡمُھُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ"۔

ارے ہم دو ایسے بشروں کو، ایسے انسانوں کو مان لیں جو ہماری طرح

کے بشر ہیں اور ان کی قوم تو ہمارے سامنے عبادت گزار ہے اور وہ ہمارے سامنے نبی ہو کر، رسول ہو کر آئے ہیں۔

اسی طرح قبیلہ ثمود و عاد کی آوازیں ہیں:

وَلَئِنْ أَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ إِنَّكُمْ إِذًا لَّخٰسِرُوْنَ

بھلا اس کی طرف خدا کی طرف سے کوئی پیغام آیا ہے اور اگر ہم ایک بشر کو مان لیں گے تو یہ بڑی گمراہی ہے ہماری کہ ایک بشر کو مان لیں۔

گویا ان کیلئے قبولِ حق میں بہت بڑی رکاوٹ تھی کہ ہم بشر کو کیونکر نبی اور رسول مان لیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مقامِ بشریت کو اپنی سطح پر لا کر انہوں نے پست بنایا تھا کیونکہ خود انتہائی پستی میں گرفتار تھے۔ اس لئے سمجھے کہ بشر اتنا ہی پست ہوتا ہے۔ لہٰذا بشر میں بلندی کا تصور کر ہی نہیں سکتے تھے۔ لہٰذا گمراہی کا سرچشمہ بشر ناشناسی تھی۔ صرف انسان کی منزل کو نہ پہچاننا کہ انسان کیا ہے؟ لہٰذا انسان کو وہ بس اپنے جیسا سمجھتے تھے۔ اُن انسانوں کو دیکھ کر اپنے کو ان جیسا بنانے کی ہمت نہیں تھی۔ طرح طرح سے ہر پارے میں بعض جگہ تابڑ توڑ مسلسل سورتوں میں آپ کو یہ آوازیں ملیں گی۔ میں نے تو چند آیات پڑھ دی ہیں، وہ سب اکٹھی کی جائیں تو کافی تعداد میں ہوں گی کہ ہر دفعہ وہ یہی کہتے تھے کہ یہ کیا بات ہوئی! بہت آسان تھا ان کا جواب۔

اگر کسی رسول کی زبان سے کہلوایا جاتا اور جب ایک رسول کی زبان سے یہ کہلوایا جاتا تو ہر رسول یہی کہتا کہ بھئی! یہ تمہاری نظر کا دھوکہ ہے کہ ہمیں بشر یا انسان سمجھ رہے ہو۔ ہم لباسِ بشری میں آئے ہیں، واقعتاً بشر نہیں ہیں۔ تو اس طرح منکرین کی زبان بندی ہو جاتی اور پھر ان کے اعتراض کی کاٹ ہو جاتی۔ مگر خالق

نے ایک دفعہ بھی کسی رسول کی زبانی یہ آسان طریقہ ان کی زبان بندی کا اختیار نہیں کیا بلکہ جو ان کے دل میں خلش تھی کہ یہ انسان ہیں، نبی کیونکر ہو سکتے ہیں، دور کرنے کی بجائے صرف انبیاء کی کوشش یہ تھی کہ جو ان کے ذہن میں نبوت اور انسانیت میں تضاد ہے، اس کو ختم کیا جائے۔

رسولوں کی وکالت میں مَیں مناظر ہوتا تو فنِ مناظرہ کے لحاظ سے یہ قاطع جواب تھا، ان کی زبان بندی کرنے کیلئے کافی تھا کہ کہا جائے کہ یہ تم سے کس نے کہا کہ یہ بشر ہیں؟ کون کہتا ہے کہ یہ حقیقت میں انسان ہیں؟ یہ انسان نہیں ہیں، یہ مصلحتاً انسان بن کر تمہارے سامنے آئے ہیں۔ اب دوسرے رُخ سے میں کہتا ہوں کہ جب یہی چیز ان کیلئے رکاوٹ تھی تو انسان کے لباس میں بھیجنے سے مصلحت کہاں ہوئی؟ مصلحت تو اس میں ہوتی ہے جس میں اچھا اثر پڑے اور جو اور مشکل بنا دے، اس سے کیا فائدہ؟ تو کسی نبی کی زبان سے آسان طریقہ اختیار نہیں کیا جاتا کہ یہ کہا جائے کہ یہ واقعتاً آدمی نہیں ہیں، یہ واقعتاً انسان نہیں ہیں، یہ دراصل کچھ اور ہیں۔ بس لباسِ انسانی میں تمہیں سدھانے کیلئے آئے ہیں۔

آخر انبیاء کی زبانوں کو قدرت کی طرف سے کیوں خاموش کر دیا گیا کہ یہ جواب نہ دو؟ یہ ان سے نہ کہو؟ نہیں، ان کے حلق سے یہی اُتارو کہ بشر ہیں اور پھر نبی بھی ہیں۔ انسان ہیں اور پھر رسول ہیں کیونکہ اگر یہ کہہ دیا جاتا کہ یہ حقیقتاً انسان نہیں ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی غلط فہمی جو مقامِ انسانیت کی پستی کے متعلق تھی، وہ تو قائم ہی رہتی اور یہ قدرت کے مقصد کے خلاف تھا کہ اپنے شاہکارِ عظیم کی توہین ہو رہی ہے اور اُسے وہ برداشت کرے۔ لہٰذا اس نے اپنی مہم یہ بنا لی۔ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ نبی اور رسول کیونکر ہو سکتے ہیں جبکہ بشر ہیں اور بشر کے ساتھ بھی وہ یہی کہتے تھے کہ ہمارا ایسا بشر۔ ان کے جواب میں یہ بجائے اس کے کہ نفی کریں، و

ہی کہتے ہیں کہ میں تو بس تمہارا جیسا بشر ہوں مگر مجھ پر وحی ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بشر وہ نہ سمجھو جس پر وحی نہ ہوسکتی ہو بلکہ تصور کرو کہ بشر ہوسکتا ہے جس پر وحی ہوتی ہے۔

میں نے کہا کہ ایک سرچشمہ ان کی گمراہی کا یہ تھا کہ بشر اور انسان اتنا ہو ہی نہیں سکتا کہ اس کو رسالت ملے، اس کو نبوت ملے یا عام نبوت اور رسالت سے بالاتر درجہ ہمارے تصور میں ہے، دنیا کے تصور میں نہیں ہے یعنی امامت ملے۔ بشریت تو بہت نیچی سطح ہے۔ بیچارہ بشر نبی کہاں ہوسکتا ہے؟ رسول کہاں ہوسکتا ہے؟ امام کہاں ہوسکتا ہے؟ لہٰذا اس بنیادی غلطی کی وجہ سے انہوں نے رسالت کا انکار کیا۔ اب اگر ہم یہ کہہ دیں کہ نہیں، بشر نہیں تھے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس گمراہی میں ہم ان کے ساتھ شریک ہیں۔ وہ بات کہ بشریت اور رسالت اور امامت ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتیں، اس غلط بنیاد کی وجہ سے انہوں نے رسالت کا انکار کیا۔ ہم بشریت کا انکار کر رہے ہیں تو دنیاوی گمراہی میں، تو ہم ان کے ساتھ شریک ہوگئے۔ اسلام کا بڑا تحفہ دنیا کیلئے یہ ہے کہ اگر اس کا انکار کریں تو بڑا جوہر انسانیت گم ہوجائے گا۔

میں کہتا ہوں کہ اسلام کا ایک بہت بڑا امتیاز گم ہوجائے گا اگر اس کے اس تحفہ کی قدر نہ کریں کہ اس نے انسان کی بلندی سمجھائی، اس نے انسان کو سمجھایا کہ وہ کیا ہے اور جب سمجھے گا کہ کیا ہے تو سمجھے گا کہ اُسے کیا ہونا چاہئے۔

اس کیلئے طرح طرح سے، مختلف طریقوں سے اس نے انسان کی اہمیت انسان کو سمجھائی۔ کبھی یوں کہا:

"لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ"۔

"ہم نے انسان کو بہترین نقطہ اعتدال پر بہترین درستگی پر پیدا کیا"۔

ہر زبان والے جانتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم میں یہ سکھایا جاتا ہے کہ اچھے اور بُرے کے دو تین درجے ہیں۔ ایک اچھا اور ایک کسی سے اچھا اور ایک سب سے اچھا۔ ایک برا، ایک کسی سے برا اور ایک سب سے برا۔ یہ ابتدائی تعلیم میں سکھایا جاتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے کہ خالق نے تیسرا درجہ صرف کیا ہے یعنی انسان کو یہ نہیں کہا کہ وہ اچھا ہے، دوسرا درجہ بھی نہیں کہا کہ کس سے اچھا ہے، کس سے اچھا ہے، نہیں ہے، تیسرا درجہ بہترین کاریگری۔ یعنی جو اس کے ہم کہتے ہیں، اللہ اکبر۔ سب سے بڑا۔ یہ اس کیلئے کہا۔ اس نے کہا کہ سب سے اچھا۔

مجھے تفصیل سے عرض نہیں کرنا ہے، مجملاً عرض کرنا ہے، غور کیجئے جو عرض کر رہا ہوں کہ اس نے کہا ہے انسان کو کہ انسان بہترین اور بہترین کے آگے میں نے کہا کہ کوئی درجہ نہیں ہے۔ جس طرح اللہ اکبر میں اب عظمت سے استثنیٰ کسی کا نہیں ہوسکتا۔ کوئی مخلوق اس دائرہ میں مستثنیٰ نہیں ہوسکتی "فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ"، بہترین نقطہ پر۔ کچھ نہ کچھ منطق ہر ایک جانتا ہے۔ ایک کُلی ہوتا ہے اور ایک فرد ہوتا ہے۔ جیسے یہ آدمی۔ تو فرد انسان ہے اور خود انسان ایک کُلی ہے جس کے تحت یہ ہے۔ اس کو جُزی کہتے ہیں۔ جو شخص ہوتا ہے، وہ نوع یا جنس ہوتی ہے۔ اب خالق کہہ رہا ہے کہ انسان درستگی کے بہترین نقطہ پر ہے۔ اس نے کہا ہے، خالق نے، مخلوقات کا جائزہ لے کر اور جائزہ لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب خلق کیا ہے تو جائزہ لئے ہوئے ہے یعنی ہم نے پیدا کیا اس نقطہ پر۔ ہوا نہیں ہے یہ اس نقطہ پر بلکہ پیدا ہی کیا گیا ہے۔ خلق کیا گیا ہے بہترین نقطہ پر۔

تو حضورِ والا! جب خالق اُس کُلی کو بہترین کُلی کہہ رہا ہے، بہترین کہہ رہا ہے تو جو فرد کائنات کا بہترین ہو، اس کو اسی کے تحت میں داخل ہونا چاہئے۔ اس نے

تو اس کُلّی کو بہترین کہا اور مجھے معلوم ہیں وہ افراد جو بہترین ہیں، وہی مقصودِ کائنات ہیں۔ وہی حاصلِ کائنات ہیں۔تو جو حاصلِ کائنات افراد ہیں، انہیں اس نوع میں درج ہونا چاہیئے جس کا نام ہے انسان!

میں کہتا ہوں کہ یہ انہی کا صدقہ ہے جو اس کو احسن ہونے کی سند ملی ہے ورنہ کیا ان آدمیوں کے لحاظ سے یہ سند ملی ہے جو کیڑوں مکوڑوں سے بدتر ہیں۔ چونکہ وہ افراد اس کے اندر ہیں، اسی لئے اس کو سند ملی ہے۔ دوسری جگہ کہا: آسمان پیدا کر دیا، زمین پیدا کر دی، سورج پیدا کر دیا، چاند پیدا کر دیا۔ سب ایک ایک جملے ہیں۔ انسان کی خلقت کا جزو اکیلا بیان کیا کہ اس کو یوں بنایا، یوں بنایا:

ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ؕ﴿۱۴﴾

ارشاد فرمایا: ہم نے شروع میں تو مٹی سے پیدا کیا، وہ حضرت آدم ابوالبشر تھے جو الگ طرز پر پیدا ہوئے اور اس کے بعد ہم نے انسان کو یوں پیدا کیا کہ نطفہ، پھر علقہ، پھر مُضغہ ہے۔حضور! اس کا کام کوئی تشریح الاجزاء ہے؟ اس کا کام کوئی طبی تحقیقات ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اپنی اس مخلوق پر اتنا ناز ہے کہ اس کے تذکرہ میں گویا کہنے والے کو لذت محسوس ہو رہی ہے۔

یہ کیا اور یہ کیا، اس طرح بنایا اور اس طرح بنایا اور نطفہ تھا اور علقہ تھا۔ یہ سب ہم سمجھ لیتے، ڈاکٹر ہو کر یا بغیر ڈاکٹر ہوئے۔ یہ سب وہ بیان کر رہا ہے۔ معلوم

ہوتا ہے کہ خالق کی نظرِ توجہ اس مخلوق کی طرف خاص ہے کہ اس کے ذکر کو وہ طول دے رہا ہے اور اب سب منزلیں طے کر لیں۔ کسی طبیب کو اپنے کسی نسخہ پر ناز ہوتا ہے تو وہ اس کے اجزاء اکثر صیغہ راز میں رکھتا ہے، بتایا نہیں کرتا مگر خالق کو اپنی تخلیق پر ناز ہے کہ سب اجزاء بتا رہا ہے کہ اب سب بتا دیا ہے، بنا سکو تو بنا لو۔

نسخہ تو میں نے پورا بتا دیا ہے۔ یوں ہوا، یوں ہوا اور ترکیبِ اجزا بھی بتا دی کہ پہلے یہ بات تھی، اس کے بعد یہ ہوا اور یہ ہوا۔ نسخے کی سب ترکیب بتا دی۔ مگر یہاں تک تو بتا دیا، اب آخر میں جا کر کچھ تھا جو پردہ میں رکھ دیا کہ وہ غلاف بھی چڑھ گیا اور گوشت پوست بھی ہو گیا، سب کچھ ہو گیا۔

"ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ"۔

جیسے لفظوں نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اب ہم نے کچھ اور بنا دیا۔ اب یہ کچھ اور جو بنایا، یہ صیغہ راز میں رکھا۔ یہ کچھ اور کا، آخر کا ایک ایسا ارادہ تھا کہ ارادہ ایک تھا مگر آنکھوں میں نور آیا، پردۂ گوش میں سماعت آئی، زبان میں ذائقہ کی طاقت آئی، شامہ میں احساسِ قوت آئی۔ یہیں سے مادیت نے ہتھیار ڈال دیئے۔ جو مادّی سبب ہو سکتا ہے، اس کے نتیجہ میں نیرنگی نہیں ہو سکتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک جسم ہے مگر جہاں وہ چاہتا ہے، وہاں بصارت رکھتا ہے، جہاں وہ چاہتا ہے، سماعت رکھتا ہے، جہاں وہ چاہتا ہے، ذائقہ رکھتا ہے۔ یہ تقسیم رزقِ وجود بہ اعتبارِ حکمت و مصلحت ہو رہی ہے۔ یہ حکیم علی الاطلاق ہی کا کام ہے، کسی اور کا نہیں۔

اب یہاں پر پہنچا کہ "اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ"، پھر ہم نے اس کو کچھ اور ہی بنا دیا۔ اور کیا بتاؤں کہ کہنے والا جسم و جسمانیات سے بری ہے مگر یہ مصیبت ہے کہ الفاظ تو جسمانیات کیلئے ہیں۔ اب وہاں کسی حقیقت کا ادا کرنا ہو تو الفاظ کہاں سے

آئیں؟ ارے پورا یہ کیا، یہ کیا اور یہ کیا۔ اب محسوس ہوتا ہے جیسے صفت کا بنانے والا صناع اس تذکرہ سے جھوم گیا، اس نے کہا:

"فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِيۡنَ"۔

ارے کیا کہنا اُس اللہ کا جو بہترین خالق ہے۔

اب خلقتِ انسان پر اپنے کو احسن الخالقین کہا۔ دور کی بات ہے مگر اب یہاں ذکر آ گیا ہے کہ کیسی کیسی روشن صنعتیں سورج، چاند، ستارے اور کیا کیا، کیسے کیسے حسین گلاب کے پھول اور وہ تمام چیزیں جن کے تذکرے میں شاعروں کو وجد آتا ہے، سب اس نے بنائیں مگر اس نے کبھی ان سب کا ذکر کر کے اپنی تعریف نہیں کی اور جب اس کا ذکر آیا، تفصیل کے ساتھ، تو آخر میں کہہ دیا کہ "فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِيۡنَ"، بابرکت ہے وہ ذات جو بہترین خالق ہے۔ انسان کی خلقت پر اپنے کو بہترین خالق کہنے نے بتایا کہ یہ بہترین مخلوق ہے۔

اس کی ایک نظیر ہے۔ اس کو تفصیل سے پیش نہیں کرنا ہے، صرف آپ کے ذہن کو متوجہ کروں گا اور صرف متوجہ کرنا نہیں ہے، اس توجہ دہانی میں ایک بڑے مسئلہ کا حل ہے۔ جو کہا جاتا ہے، اس کی رَد ہے کہ حضور رسولِ خدا کو اس نے کیسے کیسے حیرت انگیز معجزے عطا کئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ستاروں سے تسبیح کروادی مگر اس نے اس کا ذکر کوئی نہیں کیا اور اپنی تعریف نہیں کی۔ یہ سب معجزاتِ رسول میں درج ہیں، متفق علیہ ہیں کہ درختوں سے صدائے سلام بلند کروادی۔ راستہ چلتے ہیں، دیواروں اور درختوں سے صدائے سلام آتی تھی اور اس کا ذکر نہیں کیا اور اپنی تعریف نہیں کی۔ چاہِ شور کو لعابِ دہن سے شیریں کر دیا، اس کا تذکرہ نہیں کیا اور اس پر اپنی کوئی تعریف نہیں کی۔ ان کے ہاتھ میں لکڑی کو تلوار بنا دیا لیکن اس کا ذکر

بھی قرآن میں نہیں کیا اور اپنی تعریف بھی نہیں کی۔ طعامِ قلیل سے مجمعِ کثیر کو سیر کروادیا، تھوڑا سا کھانا اور ایک بڑی جماعت نے بڑے بڑے کھانے والوں نے کھالیا اور وہ کھانا ختم نہیں ہوا، مگر اس کا تذکرہ قرآن میں نہیں کیا اور اپنی تعریف نہیں کی۔ ان کی دعا سے ان کے وصی کیلئے سورج کو پلٹا دیا مگر اس کا ذکر قرآن میں نہیں کیا اور اپنی تعریف نہیں کی۔

یہ تو سب بعد کی باتیں ہیں، ولادت کے وقت بحیرۂ ساوہ کو خشک کر دیا، آتش کدۂ فارس کو گل کر دیا۔ چودہ کنگرے قصرِ کسریٰ کے گرا دیئے، یہ سب کچھ کر دیا۔ اپنے رسول کو ایسے ایسے معجزات دے دیئے اور اس کا یا تو ذکر ہی نہیں کیا یا ذکر کیا بھی تو اپنی کوئی تعریف نہیں کی۔ وہ پیغمبر کو ایک خواب دکھا دیتا اور اپنی تعریف کرنے لگتا۔ اگر اس احسن الخالقین سے یہ سمجھ میں آیا کہ یہ بہترین شاہکارِ خلقت تھا جس کا ذکر خالق نے کیا تو اس اندازِ ذکر سے دنیا سمجھے کہ معراجِ رسول اس کی قدرت کا کوئی عظیم کارنامہ تھی، تبھی اپنا ذکر اس نے اس طرح کیا، تسبیح کے ساتھ۔ وہ کہتا ہے:

"سُبۡحٰنَ الَّذِيۡۤ اَسۡرٰى بِعَبۡدِهٖ

"پاک ہے وہ جو لے گیا اپنے بندہ کو"۔

اس بندہ کے لفظ سے بھی یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ آج اس اندازِ بیان سے کہتا ہوں کہ اب روحانی معراج مان کر قرآن کی بلاغت آسمان پر رہے گی یا زمین پر آجائے گی؟

میں کہتا ہوں وہ اپنی تسبیح کر رہا ہے۔ "پاک ہے وہ ذات"، اس میں سائنس والوں کے سب اعتراضات کا جواب ہے۔ وہ یہی کہتے ہیں کہ بشر ہوتے

ہوئے یہ کیونکر گئے؟ میں کہتا ہوں بشر ہوتے ہوئے یہ گئے ہی نہیں، خدا ہوتے ہوئے وہ لے گیا۔

یہاں بھی وہ خصوصیت قائم ہے کہ اتنا بڑا معجزہ یا اتنی بلندی عطا فرمائی جس کا نام معراج ہے۔ یہ بھی بحیثیت رسول نہیں دی، بحیثیت بشر دی۔ اس لئے "بِرَسُوْلِہٖ" نہیں کہا، "بِعَبْدِہٖ" کہا ہے۔ رسالت سے وحی آتی ہے، بشریت سے عبدیت ہوتی ہے۔ اس سے بھی مقامِ بشریت نمایاں ہوتا ہے کہ انسانیت اتنی اونچی چیز ہے کہ عرش زیرِ نعلین آجاتا ہے۔

مقامِ بشر اتنا اونچا ہے کہ ملک کو اس عرض کے بعد ساتھ چھوڑنا پڑا تھا کہ اگر ذرا آگے بڑھوں تو نورِ جلال میرے پروں کو جلا کر راکھ کر دے گا۔ میں کہتا ہوں کہ اس کے بعد تو ملک کہنا ان کی توہین ہے۔ ارے خادم کو مخدوم بنا دیجئے تو یہ کوئی مخدوم کی عزت افزائی ہوئی؟ ملائکہ تو ان کے گھر کے خادم ہیں۔ ان کو ملک کہہ کر کیا تعریف ہوسکتی ہے؟ زنانِ مصر نے یوسف کو کہہ دیا تھا کہ بہت بڑا فرشتہ ہے۔ وہ ان کی نگاہ تھی، "فکر ہر کس بقدرِ ہمت اوست"۔ وہ حسن صورت کو دیکھ رہی تھیں اور فرشتے اَن دیکھی چیز تھے۔ سمجھتے تھے کہ ان سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ لہٰذا انہوں نے مَلک کہہ دیا۔ لیکن جو حقیقت شناس ہے، وہ ملک کہنا ان کی توہین سمجھے گا۔ ملک تو ان کے خدمت گار بن کر آتے ہیں۔ یہ ہے مقامِ انسانیت!

ایک اور پہلو عرض کرنا ہے تا کہ مقامِ بشریت سمجھ میں آئے کہ ان ہستیوں کو جو ہمارے نزدیک کائنات میں سب سے افضل تھیں، ان کی تعریفیں قرآن نے انسان کہہ کہہ کر کی ہیں۔ بس چند مواقع یاد دلاؤں گا۔ ایک خدا کا بندہ اس کی رضا کیلئے رسول کی چادر اوڑھ کر فدا کاری کی منزل طے کرتا ہے۔ فدا کاری کیلئے تو ذہن میں میدان ہے کہ میدان میں فدا کاری ہوتی ہے۔ مگر یہ تنگنائے چادر کے اندر

فدا کاری؟ اور مجھے معلوم نہیں کہ بدر و اُحد کے میدان کی فدا کاریوں پر کبھی خدا نے فخر کیا ہو مگر آج یہ فدا کاری جو زیرِ چادر ہو رہی ہے، اس پر اللہ فخر کرتا ہے۔ اس فدا کاری کی قیمت عام افراد کو سمجھاؤں جو عام اسباب کی بناء پر اتنی اونچی باتیں نہیں سمجھ سکتے۔ علی کھلے ہوئے علی ہوتے تو اتنے خطرہ میں نہیں تھے جتنے رسول بن کر لیٹے ہیں۔ عموماً بھیس وہ بدلا جاتا ہے جو خطرہ سے دور ہو، مثلاً مرد عورتوں کا لباس پہن کر مجمعوں سے نکلا کرتے ہیں۔ لیکن یہ نیا بھیس بدلنا دیکھا کہ جس کے قتل کا منصوبہ ہو، اس کی چادر اوڑھی جائے، اس کے بستر پر لیٹا جائے۔

اُس نے حکم دیا تھا کہ لیٹو اور کیوں لٹایا تھا؟ اس لئے کہ رسول کا جانا پردے میں رہے، یعنی دنیا یہ نہ سمجھے کہ رسول چلے گئے ہیں ورنہ اسی وقت چلے جائیں گے تلاش کرنے کیلئے۔ یہ انتظام کیا گیا تھا کہ رسول جب تک اس جگہ تک نہ پہنچ جائیں جہاں خدا نے حفاظت کا انتظام کر دیا ہے، اس وقت تک مشرکین اُلجھے رہیں اور سمجھتے رہیں کہ پیغمبر خدا بستر پر ہیں۔

اس لئے رسول نے لٹایا تھا خدا کے حکم سے۔ تو جب خدا کے حکم سے تھے تو کہوں گا کہ خدا نے لٹایا تھا اور اس لئے بستر پر لٹایا تھا۔ مگر شعراء کی زبان میں دو ایک جملے کہنا چاہتا ہوں کہ جو گھیرے ہوئے تھے، وہ اجنبی لوگ نہیں تھے، اسی قوم و قبیلہ کے لوگ تھے جس میں ۵۳ برس وہ زندگی گزار چکا، جو گیا ہے اور ۲۳ برس یہ زندگی گزار چکا جو لیٹا ہے۔ یعنی جو گھیرے ہوئے ہیں، وہ خوب اندازِ قد سے واقف اور پھر شمائل دونوں کے کتابوں میں موجود ہیں کہ دونوں بزرگوں کا قد یکساں نہیں تھا، قامتِ عصمت ایک تھا مگر قد و قامتِ جسمانی میں فرق تھا۔ تو یہ بیوقوف رات بھر سمجھتے رہے اور حقیقت نہیں سمجھے تو بیوقوف نہیں تھے تو اور کیا تھے؟ واقعتاً بیوقوف نہ ہوتے تو اسلام کیوں نہ لے آتے؟ تو بیوقوف رات بھر سمجھتے رہے کہ رسول لیٹے

ہوئے ہیں۔ یہ کیا راز ہے؟

حضور! میری سمجھ میں تو دو باتیں آتی ہیں ورنہ اسی وقت چلے گئے ہوتے۔ یہ تو ہر ایک روایتاً، درایتاً اصول سے ماننے پر مجبور ہے۔ وہ کیوں نہیں سمجھے؟ دو وجوہات ذہن میں آتی ہیں۔ جو واقعہ کو سمجھے، وہ اگر یہ دو وجوہات نہ سمجھے تو تیسری سائنسی وجہ میرے سامنے پیش کردے۔ میری سمجھ میں دو وجوہات آئی ہیں، دونوں بہرحال سائنس کی حدود سے آ گئے ہیں۔

ایک پہلو یہ ہے کہ خدا نے حکم دیا کہ بستر پر لیٹ جائیں۔ تو پھر رات بھر کیلئے اس نے ہوبہو رسول بنا بھی دیا ورنہ اس کے مقصد کو شکست نہ ہو جاتی؟ ہوبہو رسول بنا بھی دیا۔ میں کہتا ہوں کہ قرآن کے ماننے والے کو اس میں عذر نہیں ہونا چاہئے۔ اگر عیسیٰ کی حفاظت کیلئے ایک دشمنِ خدا کو ایک دشمنِ عیسیٰ کی صورت دی جاسکتی ہے تو ان سے افضل ذات محمد مصطفےٰ کی حفاظت کیلئے غیر کو نہیں، ان کے نفس کو ان کی صورت کیوں نہیں دی جاسکتی؟

حضورِ والا! یہ ایک پہلو ہے جو میری سمجھ میں آتا ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ میں کہتا ہوں کہ یہ اس چادر کی کرامت ہے، حضور کی طرف سے کرامت ہوگی، مگر یہ چادر کی کرامت ہے کہ جب پیغمبرؐ اوڑھیں تو ان کے جسم پر بالکل صحیح اور جب علیؑ اوڑھیں تو ان کے جسم پر بالکل راست اور جب پانچوں آ جائیں اور پھر بھی گنجائش رہے! ورنہ اُمِ سلمہ آنے کی کوشش ہی کیوں کرتیں اور جبرئیل امین کیوں داخل ہوجاتے؟ تو یہ چادر کی کرامت تھی اور دو جملے کہتا ہوں، یہ بہرحال چادر کی خصوصیت معلوم ہوتی ہے، اس لئے میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ بہرحال چادر کی خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ چادر قدموں پر نہیں ناپی گئی تھی، یہ نورِ واحد پر بیونتی گئی تھی۔

تو اتنا بڑا فداکاری کا کارنامہ، اس پر سندِ قبولیت لے کر جو آیت اُتری، وہ آیت کیا ہے "مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ" نہیں،

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝۲۰۷

دیکھو! انسانوں میں ایک یہ بھی ہوتا ہے جو اپنی جان کو رضائے پروردگار کیلئے فروخت کر دیتا ہے۔ اصولِ قرآنی یہ ہے کہ فرد کی مدح کرنی ہوتی ہے مگر صیغے جمع کے صرف کئے جاتے ہیں۔ رکوع میں انگوٹھی دینے والا ایک فرد تھا مگر قرآن کی آیت کے صیغے سب جمع کے۔

الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ۝۵۵

سب جمع کے صیغے، اصولِ قرآنی یہی ہے واحد کی مدح ہوگی، جمع کے صیغے ہوں گے۔ مگر یہ خاص وہ محل ہے کہ خالق نے بھی انفرادیت نمایاں کی ہے۔

"مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ"۔

انسانوں میں ایک وہ بھی ہے یعنی اس مقامِ فداکاری میں کہیں پر بھی کوئی دوسرا نہیں ہے۔ انسانوں میں ایک یہ بھی ہے۔ یہ ایک اتنی اونچی منزلِ کردار پر بھی جا کر کہتا ہے کہ انسانوں میں ایک یہ بھی ہے۔ اس کے بعد کون ہے جو مقامِ انسانیت کو پست سمجھے؟ میں کہتا ہوں کہ یہ وحدت نمایاں ہوگئی کہ دیکھو! انسانوں میں ایک ایسا بھی ہے۔ میں کیا کروں کہ اس کے بعد وحی کا دروازہ بند ہوگیا۔ میں کوئی آیت اُترتی ہوئی دکھلا نہیں سکتا، مگر میرا تصور یہ ہے کہ اگر دس محرم ۶۱ھ کو کوئی آیت اُترتی

تو شاید واحد کا صیغہ جمع کا لباس اختیار کرتا۔ اُس روز کہا جاتا کہ دیکھو! ایسے بھی انسان ہوتے ہیں۔ کچھ کی جبینِ عقیدت پر شاید شکن آجائے اور ذرا بارِ خاطر ہو جائے کہ کہاں امیر المومنین کی منزل اور کہاں کربلا میں جتنے ہیں، سب کو کہہ دیا کہ اگر آج آیت اُترتی تو سب کو کہتی۔ مگر میں کہتا ہوں کہ مجھے بھی فرقِ مراتب معلوم ہے۔ ارے سب عرب بھی نہیں، غیر عرب بھی ہیں، سب قرشی نہیں، غیر قرشی بھی ہیں، سب آزاد بھی نہیں، غلام بھی ہیں۔ اتنا زمین و آسمان کا فرق بہ اعتبارِ صفات و افعال ہے، قومیت کے اعتبار سے فرق ہے۔

مگر جہاں تک کردارِ کربلا کا تعلق ہے، قرشی و غیر قرشی کا کیا ہاشمی و غیر ہاشمی کا کیا؟ میں تو کہتا ہوں کردارِ کربلا میں مجھے معصوم و غیر معصوم کا فرق نظر نہیں آتا۔ ایک بے داغ مرقعِ کردار ہے ورنہ معصوم اپنی پاک زبان سے سب کو یکساں طور پر کیوں کہتے:

"بِاَبِیْ اَنْتَ وَاُمِّیْ طِبْتُمْ وَطَابَتُ الْاَرْضِ الَّتِیْ دُفِنْتُمْ فِیْهَا وَفُزْتُمْ فَوْزًا عَظِیْمًا"

میرے ماں باپ تم پر قربان ہوں، تم بھی پاک ہوئے اور وہ سرزمین بھی پاک ہوئی جس میں تم دفن ہو گئے۔ اب معصوم اپنی تمام کارنامہ ہائے عصمت والی زندگی کے ساتھ کہہ رہے ہیں:

"یَالَیْتَنِیْ کُنْتُ مَعَکُمْ فَاَفُوْزُ فَوْزًا عَظِیْمًا"۔

کاش! میں تمہارے ساتھ اس کامیابی میں شریک ہوتا اور اس عظیم کامیابی کو حاصل کرتا۔

ہمیں بھی سکھایا یہی گیا ہے کہ تم جب واقعہ کربلا کو یاد کرو تو یہ کہو:

"یَالَیْتَنِیْ کُنْتُ مَعَکُمْ فَنَفُوْزُ فَوْزًا عَظِیْمًا"۔

" کاش! ہم آپ کے ساتھ ہوتے اور اس عظیم کامیابی کو حاصل کرتے"۔

مصائب

میں عرض کرتا ہوں کہ پورے ہمارے رونے کا پس منظر اس جملے میں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اس گریہ کے مقابلہ میں منطق سے بھی کام لیا جاتا ہے، فلسفہ سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ طرح طرح کے اعتراضات نفسیات کی روشنی میں بھی کئے جاتے ہیں، تراشے جاتے ہیں، تلاش کئے جاتے ہیں۔ جو جو پہلو سمجھ میں آتے ہیں، وہ پیش کئے جاتے ہیں۔ ایک بڑی مہم ہے گریہ کے خلاف۔ اسی میں ایک بات ہے کہ کہنے والے کہتے ہیں کہ رونا تو بزدلی ہے، عورتوں کا کام ہے، مرد کہیں رویا کرتے ہیں؟ یہ بزدلی کی نشانی ہے۔ بعض اوقات اندازِ بیان اس طرح کا ہوتا ہے کہ سننے والا شرما جاتا ہے، سوچنے لگتا ہے کہ واقعی یہ بزدلی ہے۔

مگر کوئی شرمائے، میں تو نہیں شرماؤں گا، کوئی مجھ سے کہے کہ یہ بزدلی ہے، میں کہوں گا کہ سمجھ کے بات کیجئے، کسی معرکہ میں موجود رہ کر رونا بزدلی ہے اور کسی معرکہ میں شریک نہ ہونے پر رونا عین شجاعت ہے۔ خدا کی قسم! ہم حضرت عباس علمدار علیہ السلام کے علَم کے نیچے ہوتے تو روتے نہ ہوتے، کربلا میں کوئی روتا ہوا دنیا سے نہیں گیا۔ حبیب ابن مظاہر روتے ہوئے نہیں گئے، مسلم ابن عوسجہ روتے ہوئے نہیں گئے، زہیر ابن قین روتے ہوئے نہیں گئے۔ تمام فرزندانِ مسلم، فرزندانِ عقیل، فرزندانِ جعفر اور بھائی بھتیجے امام حسین علیہ السلام کے، ان سب میں سے کوئی روتا ہوا نہیں گیا۔ قاسم بھی اس وقت تک روئے جب تک اجازت نہیں ملی اور جب اجازت مل گئی تو ہشاش بشاش چہرہ کے ساتھ گئے۔ ہمارے مولاؑ نے، بے

شک عباسؑ نے جب پکارا تو کمر تھام لی، بے شک علیؑ اکبر کی صدا آئی تو بَین بھی کئے، روئے بھی ہیں، مرثیہ بھی پڑھا ہے، ان سب کو قابلِ انکار نہیں سمجھتا لیکن جب میدانِ جنگ میں گئے ہیں تو تاریخ طبری میں ہے، اُدھر کی فوج کا ایک سپاہی بعد میں بیان کرتا ہے، وہی طبری کے صفحات میں آیا ہے کہ میں نے کسی ایسے فرد کو نہیں دیکھا کہ زخم بھی کھا چکا ہو اور بہتر (۷۲) داغ بھی اُٹھا چکا ہو، جس کے عزیز و اقارب اور اولاد سب داغِ جدائی دے گئے ہوں اور وہ حسینؑ سے زیادہ مطمئن نظر آتا ہو اور یہ جملہ ہمارے ہاں روایت میں ہے کہ جتنا وقت صرف ہوتا جاتا تھا، مولاؑ کا چہرہ دمکتا جاتا تھا تو پھر کہوں گا کہ کربلا میں کون روتا ہوا گیا؟

مگر سید سجاد علیہ السلام عمر بھر روئے۔ اب دنیا ہمارے رونے کا مطلب سمجھے، دنیا کبھی رُخ بدل کر یہ کہتی ہے کہ صدیاں گزر گئیں، اب تک روتے ہو؟ اس سے میرے دل پر نشتر لگ جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جنہیں بروقت رونے کا حق تھا، اُنہیں رو لینے دیا ہوتا تو شاید رونا آج تک قائم نہ رہتا۔

اربابِ عزا! حسین کو رونے والوں کی کمی نہ تھی۔ زینب و اُمِ کلثوم ایسی بہنیں، لیلیٰ اور رباب ایسی بیویاں، فاطمہ اور سکینہ ایسی بیٹیاں، سید سجاد علیہ السلام ایسا فرزند! مگر رونے کہاں پائے؟ اِدھر وارث کی خبر آئی، اُدھر اشقیاء آگ لے کر خیموں کے پاس آ گئے۔ قدرت نے دیکھا، اُس نے ان کے صبر کی داد دی۔ اے لیلیٰ! تو اپنے علیؑ اکبر کو نہ رو سکی لیکن قیامت تک جوان اور نوجوان تیرے علیؑ اکبر کا ماتم کریں گے۔ اے رباب! تو اپنے بے شیر کو نہ رو سکی، لیکن قیامت تک علیؑ اصغر کا نوحہ پڑھا جائے گا۔ اے زینب! تو اپنے بھائی کو نہ رو سکی، لیکن حسینؑ حسینؑ کی صدائیں دنیا میں گونجتی رہیں گی۔

چوتھی مجلس

- اب رسول نے فرمایا: قُوۡلُوۡا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ تو ہم نے رسول کے کہنے سے کہا۔ مگر چونکہ ان کے کہنے سے کہا، اس کے معنی ہیں کہ رسالت کو مانا۔ تو ہم نے خود کہہ دیا ''مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہ'' اور جب غدیر میں اعلان کیا ''مَنۡ کُنۡتُ مَوۡلَاہُ'' تو ہم نے کہہ دیا ''عَلِیٌّ وَلِیُّ اللّٰہ۔''
- پیغمبر اسلامؐ نے توحید کی آواز اتنی بلند آہنگی کے ساتھ پیش کی کہ جہاں جہاں کسی میں شرک کی کوئی قسم تھی، وہ اپنے شرک سے شرمانے لگا۔
- میں کہتا ہوں یہ کہنے کی چیز نہیں ہے، ماننے کی چیز ہے۔ یہ دیکھئے کہ وہ مانتے تھے یا نہیں۔ اگر نہ مانتے ہوتے تو بیٹے سے کیوں کہتے کہ ان کے ساتھ نماز پڑھو۔
- فاطمہؑ کی منزل یہ ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل مردوں کیلئے نمونہ عمل ہے اور فاطمہؑ کا عمل اور کردار خواتین کیلئے نمونۂ عمل ہے۔

مریم از یک نسبت عیسیٰؑ عزیز
از سہ نسبت حضرتِ زہراؑ عزیز

اسلام اورادیانِ عالم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"وَمَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡہُ وَھُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ"۔

(اور جو اسلام کے علاوہ کوئی دین تلاش کرے وہ اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں ہوگا۔)

اس موضوع سے متعلق جو میں عرض کررہا ہوں، قرآن مجید کی ایک آیت ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِیۡنَ ھَادُوۡا وَالصّٰبِـُٔوۡنَ وَالنَّصٰرٰی مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ھُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۶۹﴾

یہ مضمون قرآن مجید میں دو مقامات پر ہے۔ ایک جگہ یہ ہے جو الفاظ میں نے پڑھے اور ایک جگہ اتنا فرق ہے کہ یہاں نصاریٰ پہلے اور صائبین بعد میں ہے اور وہاں صائبین پہلے ہے اور نصاریٰ بعد میں ہے۔ ذرا گرائمر کا فرق ہے کہ یہاں صائبین منصوب ہے اور وہاں صابئون مرفوع ہے۔ مطلب دونوں کا ایک ہے۔ لفظی ترجمے کے لحاظ سے ایسا ذہن میں آتا ہے کہ نجات کیلئے اسلام کی خصوصیت نہیں ہے۔ ترجمہ یہ ہے کہ جو ایمان لائے اور عیسائی اور صابی، یہ ستارہ پرست

ہوتے تھے اور یہودی، یہ سب جو ایمان لائیں اللہ اور روزِ آخرت پر اور نیک اعمال کریں تو ان کیلئے ان کا اجر ہے ان کے پروردگار کے ہاں اور خوف اور حزن ان کو نہیں ہے۔

اب کوئی کہے کہ آپ یہ کہہ رہے ہیں اور قرآن کی آیت یہ تھی کہ جو اسلام کے علاوہ کوئی دین اختیار کرے، وہ قبول نہیں ہوگا اور گھاٹا اٹھائے گا اور یہاں دو جگہ قرآن کہہ رہا ہے کہ یہودی اور نصرانی اور آتش پرست یہ سب۔ میں کہتا ہوں کہ یہ نام بھی بطورِ مثال ہیں یعنی کسی بھی مذہب کا ہو اور نیک اعمال کرے تو وہ نجات پائے گا اور اُسے اجر وثواب حاصل ہوگا۔ آپ کی توجہ اس طرف مبذول کروانا ہے کہ اگر ان سب ناموں کے بعد صرف "مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا" ہوتا، یہودی، نصرانی، صابی اور مسلمان، جو نیک اعمال کرے، تب وہ مطلب نکلتا جس کی خاطر یہ آیت پیش کی جارہی ہے۔ مگر یہاں "مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا" نہیں ہے بلکہ مومن و یہودی و نصرانی وصابی و مجوسی یا جو بھی نام آپ کو یاد آئیں مذاہب کے، وہ سب۔ یہ نہیں کہا جاتا کہ یہ سب اگر نیک اعمال کریں، کہا جاتا ہے کہ یہ سب جو ایمان لائیں اللہ اور روزِ آخرت پر اور پھر نیک اعمال کریں۔

جب قرآن کا مطالعہ کیجئے تو اللہ اور آخرت کے معنی ہیں اسلام یعنی یہ دوسرے ہیں عقائد کے ایک مبداء اور ایک معاد۔ ایک اللہ اور ایک آخرت۔ کہاں سے آئے؟ وجود کیونکر ہوا؟ یعنی آغازِ حیات اور انجامِ حیات۔ رسالت اور امامت سب اس کے درمیان میں ہے جیسے سماوارض کے مابین تمام کائنات ہے، ایسے مبداء ومعاد میں تمام اسلام ہے۔ اس لئے آپ قرآن میں اکثر دیکھیں گے کہ اظہارِ ایمان واسلام کیلئے صرف "یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ"، اللہ پر اور آخرت پر ایمان لائیں۔ یہی ہے، یہ گویا محاورۂ قرآنی ہے ایمانِ مکمل کیلئے کہ

"اَلْاِیْمَانُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ"، اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان۔

اب ایک اور موضوع کی بات آ گئی ذہن میں کہ اگر قرآن سے کلمہ مرتب کرنا ہے تو اللہ اور قیامت کا کلمہ پڑھئے۔ اس لئے کہ قرآن میں یہی دو چیزیں اکٹھی ہیں۔ قرآن میں شروع سے لے کر آخر تک کہیں بھی یکجا "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ" نہیں ہے۔ قرآن میں اللہ کے ساتھ یومِ آخر ہے۔ تو اگر قرآن کو کافی بنا کر کلمہ پڑھنا ہے تو بس اللہ اور قیامت کو لیجئے۔ معلوم ہوا کہ کلمہ قرآن سے نہیں پڑھا گیا اور نہ قرآن نے کلمہ سکھایا ہے اور رسول بھی جب مسلمان بناتے تھے تو لفظ "قولوا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کہتے تھے کہ "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کہو۔ تو اگر رسول کے کہنے سے کلمہ پڑھنا ہے تو عمر بھر یہی پڑھتے جایئے۔ رسول تو فقط "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" پڑھواتے تھے۔ آگے کوئی جملہ نہیں کہتے تھے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کلمہ نہ قرآن سے بحیثیت مجموعی مرتب ہوا ہے، نہ حدیث سے بحیثیت مجموعی مرتب ہوا ہے بلکہ اپنے خصوصیاتِ امتیازی، جو عقیدہ کے لحاظ سے ہیں، ان کے اظہار کا ذریعہ کلمہ ہے۔

اب رسول نے فرمایا "قُوْلُوْا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ"۔ بس "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ"، تو ہم نے رسول کے کہنے سے کہا مگر چونکہ ان کے کہنے سے کہا، اس کے معنی ہیں رسالت کو مانا۔ تو ہم نے خود کہہ دیا "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ"، اور جب غدیر میں اعلان کیا "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاہُ"، تو ہم نے کہہ دیا "عَلِیٌّ وَّلِیُّ اللّٰہ"۔

تو جناب! یہ تو ہے نہیں کہ جو یہ سب کرے، وہ سب نیک اعمال کرے بلکہ اس کے بعد کہا گیا "مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ" اور روزِ آخرت پر ایمان لائے اور نیک اعمال کرے۔ یہ دو چیزیں ہیں یعنی صرف عمل صالح پھر بھی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ عقیدہ کا ایک جزو ہے جس کا نام "اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ" ہے اور اس کے بعد پھر عمل صالح ہے۔

اب جو شروع میں سب نام لئے تھے، اس کا کیا مطلب؟ جو مطلب میں سمجھا ہوں، اس کے سوا کوئی مطلب نہیں ہوسکتا، وہ یہ ہے، شروع میں بھی تو ایک عدد "الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" موجود ہے کہ وہ جو ایمان لائے۔ جو ایمان لائے اور یہودی و نصرانی و صابی، جو ایمان لائے، اللہ اور روزِ آخرت پر، تو اس لائن میں بھی ایمان لائے اور پھر معیارِ نجات میں بھی ایمان لائے اور نیک اعمال کرے۔ کیا مطلب؟ وہ ایمان کونسا ہے اور یہ ایمان کونسا ہے جو یہودی و نصرانی کے ساتھ "اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کہا ہے، وہ پھر کیا ہے؟ اور بعد میں جو قید لگائی ہے کہ ایمان لائے اور نیک اعمال کرے، یہ کیا ہے؟

تو اب جو میں کہتا ہوں ایمان کا مطلب، اس کے بعد دیکھئے کہ نتیجہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ماضی کو نہیں دیکھا جائے گا۔ خواہ شروع سے مسلمان ہو، یہ شروع والا "اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" ہے۔ یعنی یہ نہیں ہے کہ پہلے یہودی تھا، یہ نہیں کہ پہلے نصرانی تھا، یہ نہیں کہ پہلے صابی تھا۔ جی نہیں! یعنی وہ جو پیدائشی مسلمان ہے۔ یہ پہلا "اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" ہے جو شروع سے مسلمان ہیں اور جو یہودی ہیں، نصرانی ہیں، ہیں اب نہیں، یعنی پہلے تھے ماضی میں، خواہ شروع سے مسلمان ہو، خواہ پہلے یہودی ہو، نصرانی ہو، صابی ہو، آتش پرست ہو یا ستارہ پرست ہو، جو بھی وہ پہلے تھا، اب معیارِ نجات سب کیلئے ایک ہے۔ وہ یہ کہ:

"مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ"۔

ماضی جس کا جو بھی ہو لیکن حال میں اگر دونوں شرطیں حاصل ہیں یعنی ایمان ہے اللہ اور روزِ آخرت پر، جس کے معنی ہیں اسلام اور نیک اعمال ہیں تو اس

کیلئے اس کا اجر ہے یعنی نجات ہے۔اس کا مطلب ہے کہ حال میں معیارِ نجات سب کا ایک ہے اور وہ اسلام باعمل ہے۔

جناب! تین عدد حقائق بیان ہو چکے۔ایک یہ کہ اسلام کا براہِ راست اللہ سے تعلق ہے، کسی محدود ذات سے یا محدود مکان سے تعلق نہیں ہے۔دوسرے یہ کہ دین فطرت ہے اور تیسرے جو آخر میں عرض کیا گیا۔ یہ تین خصوصیات بیان ہو چکیں۔تیسری یہ تھی کہ انسان کو انسان کی معرفت کروائی۔ چوتھا تحفہ جو اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے، وہ وحدتِ الٰہ کا ہے۔اللہ کے ایک ہونے کا تصور۔ جتنے بھی پیغمبر آئے، آدم سے لیکر خاتم تک، ایک لاکھ چوبیس ہزار، وہ سب یہی دعوت دیتے رہے کہ اللہ کو ایک مانو اور یہی امیر المومنین نے توحید کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔انبیاء کے پیغام کو توحید کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔

منطقی طور پر یہ ذرا انوکھی بات ہے کہ رسالت تو توحید پر مبنی ہے تو رسالت سے توحید کیونکر ثابت ہوگی؟ مگر دیکھئے کہ کس رُخ سے امیر المومنین علیہ السلام ثابت فرما رہے ہیں۔آپ فرماتے ہیں کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی آئے۔جو نبی آتا ہے، اسی کی بات کرتا ہے۔اس کے علاوہ اگر کوئی اور خدا ہوتا تو اس کی بھی تو کوئی بات کرتا۔ اگر کوئی اور خدا ہوتا تو اس کے بھی رسول آتے۔ یہ بیچارہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے ہوئے جو بیٹھا ہے، تو گویا اعزازی خدا ہے، عملاً تو وہ ایک ہی ہے۔وہ اگر کوئی ہیں جو اعزازی خدا بنے بیٹھے ہیں تو وہ تو بت ہیں، کام کچھ نہیں کر سکتے۔مگر نام کے خدا بنے بیٹھے ہیں۔

حضورِ والا! یہ توحید الٰہی اسلام کی خصوصیتِ خاص ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ توحید آئی تو آدمؑ کے وقت سے تھی مگر پیغمبر اسلام نے اس توحید کو ایسے جاہ و جلال کے ساتھ پیش کیا ہے کہ ان کا لقب اگر ہم پیغمبر توحید کر دیں تو تاجدارِ مدینہ سے

بہتر ہے۔لفظ تاجدارِ مدینہ تو بہت ہی محدود نگاہ کا ترجمان ہے۔تو یہ توحید کے پیغمبر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس شان و شوکت و جاہ و جلال و جبروت کے ساتھ پیغامِ توحید پیش کیا ہے کہ جہاں جہاں شرک کا شائبہ تھا، وہ اپنے اس شرک سے گویا شرمانے لگے اور کسی نہ کسی طور پر توحید کے پردہ میں چھپانے لگے۔

جہاں تثلیث تھی کہ تین ہیں، توحید نے اتنا زبردست اثر ذہن پر ڈالا کہ انہوں نے نیا پہاڑہ ایجاد کر لیا کہ تین اکم تین۔ایک تیا ایک۔توحید فی التثلیث اور تثلیث فی التوحید۔ جب آپ سے بحث ہوگی تو وہ یوں کہیں گے کہ ہم وحدت کے منکر نہیں ہیں۔ہم بھی توحید کے قائل ہیں۔مگر وہ توحید ہے تثلیث میں اور تثلیث ہے توحید میں۔ یہ کیونکر ہے؟ بس وہ اللہ جانے کہ کیونکر ہے۔

اینڈرسن صاحب سے تثلیث پر گفتگو ہوئی۔ وہ کہنے لگے کہ نجف میں گیا تھا اور علامہ شیخ محمد حسین الغطا سے ملنے گیا۔انہوں نے چائے کا انتظام کیا تھا مگر میں نے کچھ کھایا پیا نہیں، اس لئے کہ بغداد کے جو لوگ میرے ساتھ تھے، انہوں نے بتا دیا تھا کہ یہ تم کو نجس سمجھتے ہیں۔ یہ تمہیں چائے پلا رہے ہیں مگر تمہیں نجس سمجھتے ہیں۔خیر! میں خاموشی سے سنتا رہا اگر وہ مجھ سے تبصرہ نہ چاہتے۔ بتائیے یہ کیا واقعہ ہے؟ میں نے کہا کہ آپ کو چائے پینے میں کیا حرج تھا؟ زیادہ سے زیادہ وہ برتن پاک کروا لیتے؟ کوئی برتن بیکار تو نہیں ہو جاتے۔ان کا کوئی نقصان نہ ہوتا۔ان کا دل چاہتا، وہ پاک کروا لیتے۔اس بات پر بات ختم ہو جاتی تو غنیمت تھا۔انہوں نے کہا: آخر ہم کیوں نجس ہیں؟ میں نے بہت آہستہ سے، دھیمی آواز میں جتنا کہ تہذیب کے پردہ میں دھیما ہوا جا سکتا تھا، کہا کہ قرآن نے کہہ دیا ہے:

"اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ"۔

مشرکین نجس ہیں۔ یہ دشواری ہے۔ کہا: ہم کیوں مشرک ہیں؟ دیکھ لیجئے! شرک سے شرمانے لگے۔ میں نے پھر بہت ہی آہستہ سے، بہت ہی سست الفاظ میں کہا: بھئی تثلیث کی وجہ سے۔ تثلیث کی وجہ سے۔ فوراً جو چھوٹا سا جاہل بچہ کہے گا کہ وہی معلوم ہوا کہ پروفیسر کہتا ہے کہ وہ تو توحید ہے فی التثلیث اور تثلیث ہے فی التوحید۔

اب میں نے پھر رواداری برتی اور بعد میں افسوس ہوا کہ میں نے صاف کیوں نہ کہا۔ میں نے کہا کہ یہ چیز ہماری عقل میں نہیں آتی "توحید فی التثلیث اور تثلیث فی التوحید"۔ یہ ہماری عقل میں نہیں آتی۔ میری اس تہذیب اور رواداری سے انہوں نے غلط فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے کہا کہ بس! بات یہی ہے کہ یہ آپ کی عقل میں نہیں آتی۔ میں نے کہا کہ کسی عاقل کی عقل میں نہیں آتی۔ مگر اب جو بات انہوں نے کہی اس کے بعد، اس کا جواب میں نے دے لیا۔ اگر کوئی اور مسلمان عالم ہوتا تو میں نہیں سمجھتا کہ اتنی آسانی سے نکلتا۔ انہوں نے کہا کہ جناب! ہم تو تین کا مجموعہ مانتے ہیں اور آپ کے ہاں تو ایک ذات اور نو صفات ہیں۔ صفات زائد بر ذات ہیں، دنیا کے نزدیک، یعنی مسلمان اکثریت کے نزدیک کہ خدا ہے اور پھر ایک چیز ہے علم اور ایک چیز ہے قدرت، ایک چیز ہے حیات۔ بچوں کو آٹھ صفاتِ ثبوتیہ سکھائے جاتے ہیں۔ تو ایک خدا اور آٹھ عدد صفات۔

تو آپ تو نو کا مجموعہ مانتے ہیں۔ اب مجھے اس جملے کا بدلہ لینے کا موقع مل گیا اور میں نے کہا کہ افسوس ہے کہ آپ اسلامیات کے پروفیسر ہیں، اتنی بڑی جگہ اور آپ کو یہ نہیں معلوم کہ جس سے آپ بات کر رہے ہیں، وہ نہیں مانتا صفات کو زائد بر ذات۔ ہم تو صفات کو عین ذات مانتے ہیں، ہمارے نزدیک تو ذات کے علاوہ اور کچھ ہے ہی نہیں۔ چند برس کے بعد دہلی میں ایک مجلس مکالمہ تھی جس میں تمام دنیا

کے پروفیسر جمع تھے۔ اس میں وہ دور بیٹھے تھے، اُٹھ کر آئے اور خلوص کے ساتھ مصافحہ کیا۔ اس کا مطلب تھا کہ انہوں نے اس ناگواری کو محسوس نہیں رکھا۔

تو حضورِ والا! غور فرمائیے کہ توحیدِ الٰہی کو اس طرح پیش کیا کہ جہاں جہاں توحید نہیں ہے، یہ بعد میں نہیں ہوا، اسی وقت مشرک اپنے شرک کو سمجھانے لگے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اپنی بت پرستی کی تاویل کیوں کرتے کہ:

"مَانَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى"۔

ہم ان کی عبادت نہیں کرتے ہیں مگر اس لئے کہ یہ ہم کو اللہ سے قریب کریں، ہمیں تقرب عطا کریں۔

ہم درحقیقت اللہ ہی کے طلبگار ہیں۔ ان کو گویا بالکل برابر برابر نہیں سمجھتے۔ ایک مسلمان میں اور ان میں یہ فرق ہے کہ وہ جس چیز کی تعظیم کرتا ہے، اس سے اگر پوچھئے کہ تم عبادت کرتے ہو تو وہ کہے گا: نہیں نہیں، ہم اس کی عبادت کرتے ہی نہیں، ہم اس کی تعظیم کرتے ہیں، عبادت خدا کی کرتے ہیں۔

بس! جب اس نے عبادت اور تعظیم میں فرق کیا، وہ شرک کے دائرے سے نکل گیا۔ وہ تاویل کر رہے ہیں مگر نسبت عبادت کی انہی کی طرف دے رہے ہیں کہ ان کی ہم عبادت کرتے ہیں، اس لئے کہ اللہ سے ہمیں قریب کریں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ معبود وہ ان کو مانتے ہیں اور ایک مسلمان، اگر وہ صحیح مسلمان ہے، تو وہ کسی کی بھی تعظیم کرے مگر معبود اسے نہیں مانے گا۔ وہ عبادت ان کی کرنے سے انکار کرے گا۔ کسی سے کہئے کہ علَم کو جو اس نے بوسہ دیا ہے، تو اس کی عبادت کی؟ وہ کہے گا: توبہ توبہ، میں علَم کی عبادت نہیں کرتا ہوں، میں احترام کرتا ہوں، تعظیم کرتا ہوں۔ بس اس کے ذہن میں احترام اور عبادت میں فرق ہے۔

یہ قضیہ عرض کر دوں کہ عبادت کسی نوعیتِ عمل کا نام نہیں ہے۔ اگر ایک اشارہ کیا جائے خدا سمجھ کر تو وہ عبادت ہے اور شرک ہے اور اگر سجدہ بھی کر لیا جائے، بغیر نیتِ عبادت کے، تو وہ چاہے شرعِ اسلامی میں گناہ ہو مگر شرک نہیں ہوگا۔ اس لئے میں نے کہا کہ سجدہ غیر اللہ کیلئے اسلام میں ممنوع ہے۔ ممنوع ہونے کے یہ معنی ہیں کہ گناہ ہے لیکن عبادت نہیں ہے۔ عبادت اگر ہوتی تو پھر کسی دَورِ رسالت میں نہ ہوتی، اس لئے کہ شریعت بدلتی ہے، اصولِ دین نہیں بدلتے۔ اگر سجدہ غیر اللہ کو عبادت ہوتا تو آدم کو بھی سجدہ نہیں کروایا جا سکتا تھا۔ یوسف کے سامنے یعقوب اور ان کے بھائی بھی سجدہ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ توحید کا اصول ازل سے ایک ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ گناہ ہے، عبادت نہیں ہے۔ شرک نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک سجدہ غیر اللہ کیلئے جائز نہیں ہے۔ اس کیلئے رسول کی حدیثیں ہیں کہ اگر سجدہ غیر اللہ کیلئے جائز ہوتا تو میں زوجہ کو حکم دیتا کہ وہ شوہر کو سجدہ کرے۔ (یہ حدیث آجکل کے ترقی یافتہ دَور کے تقاضوں کے خلاف ہے)۔ دوسری حدیث ہے کہ اگر سجدہ غیر اللہ کو جائز ہوتا تو میں شاگرد کو حکم دیتا کہ اُستاد کو سجدہ کرے۔ آجکل تو دورِ حاضر کے ترقی یافتہ طلباء اُستاد کے خلاف ہر قسم کی تشدد آمیز کارروائی کیلئے تیار رہتے ہیں، خصوصاً کالج اور یونیورسٹی کے طالب علم۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ تو ہماری وجہ سے اُستاد ہوا ہے۔ یعنی ہم اس کیلئے نہیں ہیں، یہ ہمارے لئے ہے۔ یہ ان کی منطق ہے۔ اگر یہ منطق صحیح ہو تو میں کہتا ہوں کہ اُمت کے افراد رسولوں کیلئے نہیں ہیں، رسول اُمت کے افراد کیلئے ہیں۔ وہ بھی تو سکھانے کیلئے ہوتے ہیں۔ تو اُمت کے افراد کہیں کہ وہ ہمارے لئے ہیں تو ہم اونچے ہیں اور (معاذ اللہ) وہ نیچے ہیں۔

حضور! یہ دیکھئے کہ خالق نے اُستاد کو معلم کا درجہ دیا ہے جو خود خالق کا

درجہ ہے، وہ معلم خلائق ہے اور اس نے شاگردوں کو وہ حیثیت دی ہے جو بندوں کو پروردگار کے ساتھ ہے۔ ملائکہ بھی بارگاہِ قدس کے طالب علم ہیں۔

میں کہہ رہا تھا کہ پیغمبر اسلام نے توحید کی آواز اتنی بلند آہنگی کے ساتھ پیش کی کہ جہاں جہاں کسی میں شرک کی کوئی قسم تھی، وہ اپنے شرک سے شرمانے لگا اور اس کو توحید کے پردوں میں چھپانے لگا۔ یہاں توحید ہی پر پورا زور تھا کیونکہ اگر یہ کہا جاتا کہ اللہ خدا ہے تو پورا عرب کلمہ پڑھ لیتا کیونکہ جو تین سو ساٹھ کو مان رہے تھے، ان کو اکسٹھویں (٦١) کے ماننے میں کیا عذر ہوتا! مگر یہاں یہ کلمہ نہیں سکھایا جا رہا تھا کہ کہو کہ اللہ خدا ہے۔ یہ کلمہ سکھایا جا رہا تھا "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ"، کوئی خدا نہیں سوائے اللہ کے۔ اللہ کو ماننا مشکل نہیں تھا، غیر اللہ کو نہ ماننا مشکل تھا۔

اُردو زبان میں یوں کہہ سکتا ہوں کہ ان کو ایک خدا کے ماننے میں عذر نہ تھا، خدا کو ایک ماننے میں عذر تھا اور یہاں یہ تھا کہ ایک خدا کو ماننے سے بات نہیں بنے گی۔ خدا کو ایک مانو۔ بہت سے خداؤں کو انہوں نے ایک خدا بنا دیا۔ یہ عجیب بات ہے۔ عجیب کے معنی روایاتِ قدیمہ کے خلاف۔ یعنی بڑی دلیل ان کی یہی تھی کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی راستے پر دیکھا ہے تو ہم اسے مانے چلے جائیں گے۔ بہت سی غلط باتوں کیلئے ہمارے عوام بھی اسی قسم کی دلیل پیش کرتے ہیں۔ صاحب! ہم نے اپنے باپ کو یہی کرتے دیکھا، اپنے دادا کو یہی کرتے دیکھا۔ قرآن نے اس کے جواب میں یہی کہا ہے کہ باپ دادا کے حوالے دینے سے کام نہیں چلے گا۔ اگر وہ بھی عقل نہ رکھتے ہوں تو؟ یعنی تمہیں خود اپنی عقل سے سوچنا چاہئے کہ یہ صحیح ہے یا نہیں۔ باپ دادا کی عقل کی عینک لگا کر سوچنا غلط ہے۔ خود اپنی عقل کی آنکھ سے دیکھنا چاہئے کہ یہ صحیح ہے یا نہیں۔ ان کو بڑی مشکل یہی تھی۔ یہاں یہی کہنا تھا کہ کہو "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ"، اس وقت کے جاہل عرب نہ سمجھتے ہوں کہ اللہ کو

ایک کہنے سے "تُفْلِحُوْا" "تمہارا فائدہ ہوگا" ۔ اللہ کو کہیں ایک اور فائدہ ہوگا ہمارا۔ یہ اور بات ہے۔ فائدہ ہوگا اُس کا ہوگا، نہ ہوگا اُس کا نہ ہوگا جس کے رقیبوں کا خاتمہ کریں گے۔ اُسے ایک کہیں اور فائدہ ہو ہمارا!

مگر دیکھئے! اندازِ تبلیغ رسول کا تحکمانہ نہیں ہے۔ کہہ رہے ہیں کہ یہ کہو۔ ناصح کے انداز میں کہہ رہے ہیں۔ دردمند کے انداز میں کہہ رہے ہیں کہ تمہارے فائدے کیلئے کہتا ہوں کہ "لَآ اِلٰهَ اِلَّا الله" کہو۔ مانو۔ کہو یہ کوئی وظیفہ نہیں ہے جو سکھایا جارہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مانو۔ اس قول کو اختیار کرو۔ یہ کہنا وہ ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ ہمارا قول یہ ہے۔ یہ کوئی وقتِ خاص پر کہنے والی بات نہیں ہے۔ لوگ کلمے کو وقتِ خاص پر کہنے کی بات سمجھتے ہیں۔ اسی لئے روایتیں وضع کی ہیں کہ اس وقت پر کہا کہ کہیں۔ انہوں نے نہیں کہا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ کہنے کی چیز نہیں ہے، یہ ماننے کی چیز ہے۔ یہ دیکھئے کہ وہ مانتے تھے یا نہیں۔ اگر مانتے نہ ہوتے تو بیٹے سے کیوں کہتے کہ ان کے ساتھ نماز پڑھو؟ اگر مانتے نہ ہوتے تو اس پیغام کی حمایت میں عمر بھر جان کیوں لڑائے رکھتے؟ جب ماننے کا سوال طے ہوگیا تو کہنے کی اہمیت کیا ہے؟ کہا نہیں میں کہتا ہوں کہ جس کا ایمان سب پر مسلّم ہے، چاہے جس عمر میں، آپ باپ کے بارے میں یہ حدیث سوچتے ہیں کہ کب کہا، کلمہ کب پڑھا؟

میں کہتا ہوں کہ بیٹے کیلئے ثابت کیجئے کہ علی نے کبھی کلمہ پڑھا؟ بس آئے اور نماز پڑھنے لگے۔ دوسرے بھائی جعفر آئے، کچھ دن کے بعد وہ نماز پڑھنے لگے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب وہ تھے جو بغیر کلمہ پڑھے پہلے سے مسلمان تھے کیونکہ نماز بغیر اسلام کے ہوتی ہی نہیں۔ جب نماز پڑھنے چلے تھے، اس وقت رسول کو کلمہ پڑھوانا چاہئے تھا۔ جب نہیں پڑھوایا تو سمجھئے کہ یہ کلمہ پڑھنے سے مستغنی ہیں۔ میں کہوں گا کہ جب پہلی دفعہ وحی آئی اور جبرئیل امین آئے تو انہیں اقراء لے کر نہیں آنا

چاہئے تھا، کلمہ لے کر آنا چاہئے تھا۔ تو جب رسول ہو جاتا ہے بغیر کلمہ پڑھے تو مومن بغیر کلمہ پڑھے کیوں نہ ہوگا؟

پس پورا پیغام یہ ہے:

"قُوْلُوْا لَآ اِلٰهَ اِلَّا الله"۔

اس وقت جاہل عرب یہ نہیں سمجھتے تھے کہ اللہ کو ایک ماننے سے کیا فائدہ ہے؟ میں کہتا ہوں کہ آجکل جب ذہن کی بہت ترقی ہو چکی، اب دنیا سمجھے کہ اللہ کو ایک کہنے سے، ایک ماننے سے ہمارا کیا فائدہ ہے؟ یاد رکھئے کہ تمام دنیا تڑپ رہی ہے دو چیزوں کیلئے، ایک اخوت اور ایک مساوات۔ یعنی برابری اور برادری۔ ان دونوں چیزوں کیلئے پریشان ہے۔ اسی لئے یہ دولت کی برابر تقسیم کا نظریہ ہے۔ امیروں سے چھینو اور غریبوں کو دے دو۔ اس لئے کہ دولت مند اپنی دولت سے غریبوں کو پامال کرتا ہے۔ جب برابر سے تقسیم کر دیں گے، نہ امیر رہے گا، نہ غریب، سب یکساں ہو جائیں گے تو کون کس کو دبائے گا؟ مقصد تو ٹھیک ہے مگر علاج کا طریقہ درست نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ نوعِ انسانی میں اگر تفرقہ فقط دولت وغربت کا ہوتا تو دولت کو برابر سے تقسیم کر کے آپ سمجھ لیتے کہ مساوات قائم ہوگئی مگر نوعِ انسانی میں تفرقہ فقط دولت وغربت کا نہیں ہے، بازوؤں کی طاقت میں بھی فرق ہے۔ ایک قوی ہیکل ہوتا ہے، دوسرے بیچارے دھان پان سے ہوتے ہیں۔ اور جناب! ایک چیز ہے وجاہت۔ ایک بااثر ہوتا ہے، دوسرے بے اثر ہوتے ہیں۔ ایک چیز ہے قوم و قبیلہ۔ ایک کا جتھا بڑا ہوتا ہے، خاندان بڑا ہوتا ہے، ایک بیچارہ یوسفِ بے کارواں ہوتا ہے۔ اس کے قبیلے اور خاندان کے افراد ہے ہی نہیں یا کم ہیں۔ ایک چیز ہے

دماغی فوقیت۔ ایک ذہین ہے، دوسرے لوگ سادہ لوح ہیں، بھولے بھالے ہیں اور اکثریت انہی کی ہوتی ہے۔

جس طرح دولت مند اپنی دولت سے غریب کو دباتا ہے، اسی طرح بازوؤں کی طاقت والا اپنے بازوؤں کی طاقت سے کمزوروں کو دباتا ہے۔ کسی محلے میں کوئی پہلوان صاحب ہوں تو دیکھئے جتنے اہل محلہ ہیں، وہ ان سب کے رحم وکرم پر ہوجاتے ہیں یا نہیں؟ اس لئے کہ وہ بحمد للہ اتنے طاقت وقوت کے تیس مارخاں ہیں۔ وہ سب ان سے ڈریں گے۔ اسی طرح جو قوم و قبیلے والا ہے، وہ اپنے قوم و قبیلہ کی کثرت کے برتے پر دوسرے لوگوں کو دباتا ہے۔

ارے ایک زمانہ میں قوم وقبیلہ ہوتا تھا، اب پارٹی ہوتی ہے۔ جس کی پارٹی بڑی ہے، وہ اپنی پارٹی کی کثرت کی بناء پر دوسرے لوگوں کو دباتا ہے۔ ایک دماغی فوقیت والا اپنی ذہانت سے ایسی ترکیبیں بنالیتا ہے کہ دوسرے لوگ ہمدرد سمجھ کر اس کے قبضے میں چلے جاتے ہیں اور سب اس کو اپنا راس و رئیس مان لیتے ہیں۔ یہ سب ہوتا ہے۔ دولت تو باہر کی چیز ہے، وہ آدمی کا جز نہیں ہوتی۔ اس کی تصویر کشی امیرالمومنین علیہ السلام نے اس طرح کی ہے:

"اَنۡ یَبۡقٰی لَکَ فَلَا تَبۡقٰی لَہٗ

"یہ دولت تمہارے لئے رہ بھی جائے تو تم اس کیلئے نہیں رہو گے"۔

ہو تو سکتا ہے کہ یہ آدمی رہے اور دولت ہی کسی طرح چلی جائے اور ہوسکتا ہے کہ دولت رکھی رہے اور یہی چل بسیں۔ یا وہ وفا نہ کرے گی یا یہ وفا نہ کریں گے۔ تو جب بیرونی چیز ہے دولت، تو اس کا برابر سے تقسیم کرنا کونسا مشکل ہے۔ دولت کو آرام سے تقسیم کرسکتے ہیں لیکن بازوؤں کی طاقت کا کیا کیجئے گا۔ کیا

طاقتوروں کے بازوؤں سے طاقت کو کھینچ کر کمزوروں میں تقسیم کیجئے گا؟ یہ ہوسکتا ہے کہ ایسی غذائیں کھلائیے کہ سب کمزور ہوجائیں لیکن جس تناسب سے وہ طاقتور کمزور ہوگا، اسی تناسب سے وہ کمزور قبر کے کنارے پہنچے گا۔ تو اس تفرقہ کو آپ مٹا نہیں سکتے اور وجاہت کا کیا کیجئے گا؟ کیا اُسے بھی نمایاں افراد سے لے کر غیر نمایاں افراد میں تقسیم کیجئے گا؟ قوم وقبیلہ کا کیا کیجئے گا؟ کیا افرادِ خاندان کو بھی تقسیم کیجئے گا؟ دماغی فوقیت کا کیا کیجئے گا؟ کیا اُسے ذہین افراد کے دماغ سے لے کر کسی انجکشن کے ذریعہ سے سادہ لوحوں میں اور بیوقوفوں میں تقسیم کیجئے گا؟

آپ سمجھیں گے کہ سب برابر کے عقل مند ہوگئے اور میں سمجھوں گا کہ سب برابر کے بیوقوف ہوگئے۔ جب یہ سب کچھ نہیں ہوسکتا تو دولت کو برابر سے تقسیم کر کے یہ سمجھ لینا کہ مساوات ہوگئی، طفل تسلی نہیں تو اور کیا ہے؟ وہ اسلام جو خالق کائنات کی طرف سے تھا، اس سے بڑھ کر مزاجِ بشر سے واقف کون ہے؟ اس نے محسوس کیا کہ عملی طور پر یکسانی کے ساتھ مساوات قائم کردینا ناممکن ہے۔ ارے زمینیں یکساں نہیں ہیں، کوئی بلند ہے، کوئی پست، کوئی زرخیز، کوئی بنجر۔ پہاڑ سب یکساں نہیں ہیں، کوئی بلند ہے، کوئی پست۔ درخت سب یکساں نہیں ہیں، کوئی طویل کوئی قصیر۔ حیوان سب یکساں نہیں ہیں، کوئی طاقتور ہے، کوئی کمزور۔ تو جب کائنات میں مساوات یکسانی کے معاملہ میں مماثلت کے معنی میں نہیں ہے تو انسانوں میں کیونکر ہوسکتی ہے۔ یہ تو سنت تخلیق کے خلاف ہے۔ لہٰذا یہ فرقے تو نہیں مٹ سکتے مگر ذہنیت کی تعمیر ایسی ہونی چاہئے کہ ایک بازوؤں کی طاقت والا اپنی طاقت سے کمزوروں کو دبائے نہیں بلکہ ان کا محافظ ہوجائے اور ایک صاحبِ قوم وقبیلہ اپنے قبیلے کی کثرت سے یا پارٹی کی کثرت سے بے نوا اور بیکس افراد کو پامال نہ کرے بلکہ ان کا پاسبان بن جائے۔ ایک دماغی فوقیت والا اپنی ذہنیت کو دوسروں کی تخریب

میں صرف نہ کرے بلکہ تعمیر میں صرف کرے۔

یہ بات ہوجائے تو ایک فرد کو اللہ کی دی ہوئی نعمت تمام نوع کا سرمایہ بن جائے اور اگر یہ ہوجائے تو دولت مندی بھی لعنت نہ رہے اور اگر ذہنیت کی تعمیر نہیں ہوتی ہے تو ہزار مرتبہ دولت کو برابر تقسیم کر دیجئے، عدلِ کلّی قائم نہیں ہوگا اور ظلم کا خاتمہ نہیں ہوگا۔ لیکن یہ تعمیر ذہنیت کیونکر ہو، اس کیلئے احساسِ اخوت کی ضرورت ہے۔ دنیا قانون کے دباؤ سے مساوات قائم کر کے بھائی بھائی بنانا چاہتی ہے، لہٰذا وہ عمارتِ بے بنیاد ہے۔ ذہنیت کی تشکیل اگر اس طرح ہوجائے کہ ہر انسان دوسرے انسان کو اپنا بھائی سمجھے تو یہ عمارت پائیدار ہوگی۔

اب یہ بات کہ اخوت کیونکر پیدا ہو، برابری کیونکر پیدا ہو، اس کیلئے ہر آدمی غور کر سکتا ہے کہ اس راز کو دیکھئے اور سمجھئے کہ بھائی ہوتا کیونکر ہے؟ یہ سگے بھائی کیوں بھائی ہیں؟ اس لئے کہ ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ تو ایک ماں باپ کی اولاد دس ہوئے تو دس بھائی بہن، اور پچاس ہوئے تو پچاس بھائی بہن۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ نہ دیکھئے کہ کثرت کتنی بڑی ہے، یہ دیکھئے کہ وحدت نے کتنے افراد کو پرو دیا ہے۔ اس کے بعد یہ دیکھئے کہ دیہاتوں میں یہ محاورہ ہے کہ یہ ہماری برادری کے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ باپ تو اپنا الگ الگ ہے مگر پانچ چھ پشت پر کوئی مورثِ اعلیٰ ہے کہ اس کی اولاد میں دونوں ہیں۔

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ جتنی بھی دور جا کر ایک کا احساس پیدا ہو، وہیں سے برادری قائم ہوتی ہے۔ اس کے بعد غور کیجئے، یہ ہمارے ہم وطن ہیں۔ یہ کیا ایک دیس کے باشندے، اور اگر کسی دوسرے وطن میں اپنے وطن کے آدمی کو دیکھ لیا تو چاہے وہاں کبھی شناسائی بھی نہ ہو لیکن دل چاہا کہ قریب آئیں، کچھ اپنی کہیں، کچھ ان کی سنیں۔ یہ وطن کا احساس ہے۔ دنیا نے اور ترقی کی تو یہ سمتوں کا احساس قائم

ہوا کہ یہ مغرب ہے اور یہ مشرق ہے۔ لہٰذا مسائل پر یوں غور ہونے لگا کہ کون یورپ کیلئے کارآمد و مفید ہے اور کون ایشیاء کیلئے مفید ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا تڑپ رہی ہے، اُس ایک کیلئے جو زیادہ سے زیادہ رقبہ کو ایک بنا سکے۔ مگر جتنی اکائیوں کا تصور ہوا، یہ سب تفریق کا پیش خیمہ ہے کہ جب ایک باپ کی اولاد میں ایکا ہوگا تو دوسرے باپ کی اولاد کے مقابلہ میں محاذ ہوا۔ جب ایک برادری والوں میں ایکا ہوگا تو دوسری برادری والوں کے مقابلہ میں محاذ ہوا۔ جب ایک ملک والوں میں ایکا ہوگا تو دوسرے ملک والوں کے مقابلہ میں محاذ ہوا۔ جب ایک سمت والوں میں ایکا ہوگا تو دوسری سمت والوں کے مقابلہ میں محاذ ہوگا۔ ہر اتحاد افتراق کا پیش خیمہ ہے کیونکہ اتحاد کے مرکز عالم انسانیت کے بیچ میں اٹھائے جار ہے ہیں، لہٰذا ہر دیوار ادھر والوں کو ایک کرتی ہے، اُدھر والوں سے جدا کرتی ہے۔

اسلام جو ہمہ گیر برادری کا پیغام لے کر آیا تھا، اس نے یہ کام کیا کہ درمیان کی اتحاد کی دیواروں کو ڈھا کر نہیں بلکہ بلند مقاصد کیلئے نظر انداز کر کے ایک احاطہ اتحاد کا ایسا تعمیر کیا جس میں نہ زبان کی تفریق ہے، نہ ملک کی تفریق ہے، نہ رنگ کی تفریق ہے، نہ نسل کی تفریق ہے، نہ سمت کی تفریق ہے اور وہ خدائے واحد کا ایکا ہے۔ کوئی مجھے بتائے کہ ایک باپ کی اولاد بھائی بھائی ہے، ایک مورثِ اعلیٰ کی نسل کے لوگ بھائی بھائی ہیں۔ ایک ملک کے باشندے بھائی بھائی ہیں۔ ایک سمت کے رہنے والے بھائی بھائی ہیں۔ ایک خدا کی مخلوق کیوں بھائی بھائی نہیں ہیں مگر اصول وہی ہے کہ بھائی کے حقوق کو وہی یاد رکھے گا جس نے باپ کو یاد رکھا ہوگا۔ اور جو باپ کو بھول جائے، تو پھر بھائی کے حقوق کیسے؟ یہ وجہ تھی کہ پیغمبر اسلام نے پوری طاقت اس ایک کے یاد دلانے پر صرف کر دی۔ تمام عالم انسانیت بغیر تفریق اسلام وغیر اسلام غور کرے کہ یہ وحدت خالق کا پیغام اتحادِ خلائق کا سنگِ بنیاد ہے۔

اسی بناء پر اسلام دین مساوات ہوا یعنی وہ تمدن جو زیر سایہ توحید قائم ہوتا ہے، اس کا نام ہے مساوات اور اس مساوات کی خصوصیت یہ ہے کہ گورے اور کالے میں کوئی فرق نہیں۔ ایک قوم اور دوسری قوم میں کوئی فرق نہیں۔ دیسی اور بدیسی میں کوئی فرق نہیں۔ سب خدا کے پیدا کردہ ہیں۔ لہٰذا سب کے حقوق وفرائض برابر ہیں۔ یہ وحدتِ خالق کے زیر سایہ جس تمدن کی تشکیل ہوتی ہے، اس کا نام مساوات ہے۔ اس کے زیر سایہ جو تمدن ہوتا ہے، اس میں اور تفریقوں کا کیا ذکر، اپنے دوست اور دشمن کی بھی تفریق نہیں ہوتی۔ قرآن مجید نے کہا:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ط

یہ اس وقت کیلئے ہدایت ہے جب مسلمان برسر اقتدار ہوں۔ ارشاد ہو رہا ہے کہ دیکھو! کسی قوم کی عداوت تمہیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل نہ کرو۔ تم انصاف نہ کرو۔ عدل تمہارا فریضہ ہے، چاہے یگانے کے مقابلہ میں ہو چاہے بیگانے کے مقابلہ میں ہو۔ اب اس کے زیر سایہ جو اس تمدن کی تعمیر ہوتی ہے، اس میں پھر اپنا بھائی بھی اپنے حق سے زیادہ مانگتا ہے۔ تو اس کی فرمائش کی تعمیل نہیں ہونی چاہے وہ خفا ہو کر غیر سے مل جائے۔ یعنی نظر ظاہر میں یہ سیاسی شکست برداشت کر لی جائے گی مگر مساواتِ اسلامی کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔ ظاہر ہے سیاسی طور پر گویا یہ کتنی بڑی ادھر کی فتح ہے کہ سگا بھائی میری طرف آ گیا۔ اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی۔

مشہور روایت کے مطابق عرض کر رہا ہوں کہ جو گیا تھا، اس میں عملی کمزوری تھی، اعتقادی کمزوری نہیں تھی۔ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی مگر اس نے اپنے اعتقادی استحکام سے اُسے ناکام بنا دیا۔ جنابِ عقیل سے کہا کہ منبر پر جاؤ اور

بتاؤ کہ تمہارے بھائی نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا؟ یہ بلا تکلف اقرار کر لیتے ہیں۔ بے شک صاف صاف کہوں گا کہ میرے ساتھ کیا کیا۔ بہت خوشی ہوئی کہ دیکھو! سگا بھائی جب منبر پر جا کر کہے گا تو دنیا سمجھے گی، بڑی خوشی ہوئی، بلا تکلف منبر پر جانے دیا۔ انہوں نے جا کر کہا: اے لوگو! گواہ رہنا کہ میں نے بہت کوشش کی کہ میرا بھائی اپنے دین پر مجھے ترجیح دے دے مگر ایسا نہیں ہو سکا۔ اُس نے اپنے دینی تقاضے پر مجھے ترجیح نہیں دی۔ تم سب گواہ رہنا کہ اِنہوں نے مجھے اپنے دین پر ترجیح دے دی۔

یہ مساوات ہے کہ دشمن کیلئے ہماری لغت میں قاتل سے بڑھ کر کوئی لفظ نہیں ہے۔ جب ہم کسی کو اپنا نتہا دشمن کہیں گے تو کہیں گے: ارے وہ تو میرا قاتل ہے۔ لیکن اب دیکھئے کہ زیر سایہ توحید جو مساوات قائم ہوتی ہے، اس میں کیا ہوتا ہے؟ کبھی کی ضرب ہو، جس کا زخم بھر چکا ہو، وہ اور بات ہے لیکن جس نے ابھی ضرب لگائی ہے جس کے اثرات ابھی پورے جاہ وجلال کے ساتھ موجود ہیں اور وہ گرفتار ہو کر سامنے آتا ہے، تو پہلے نگاہ اس کے بندھے ہوئے ہاتھوں پر چلی جاتی ہے، حالانکہ یہ ان کی طرف کا آدمی تھا۔ لہٰذا اس نے رسیوں سے نہیں باندھا تھا، ہتھکڑیاں نہیں ڈالی تھیں، اپنے رومال سے دونوں ہاتھوں کو کس کر باندھ دیا تھا۔ فوراً کہا کہ اس کے ہاتھ کیوں بندھے ہیں؟ اس کے ہاتھ کھلوا دیئے۔ اس کے بعد اس کے ضمیر پر اتمامِ حجت کیلئے ایک سوال کیا کہ کیوں کیا؟ میں تمہارا اچھا امام نہیں تھا؟ اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ بس بات ختم ہوگئی۔ اب حسن مجتبیٰ سے فرما رہے ہیں کہ جاؤ! یہ تمہارا قیدی ہے۔ یعنی شہنشاہِ ملتِ اسلامیہ اور ہمارے نزدیک دین و دنیا کا شہنشاہ۔ مگر ان کا قاتل جیل نہیں بھیجا جاتا۔ اپنے گھر کے ایک کمرہ میں رکھا جاتا ہے کہ اس کو رکھو، یہ نظر بندی ہے۔ علی کے دَور میں جیل خانہ نہیں

تھا۔فرماتے ہیں: لے جاؤ، یہ تمہارا قیدی ہے۔

مگر حسنؑ سے کہہ رہے ہیں کہ جو خود کھانا، وہ اسے کھلانا۔ جو پانی خود پینا، وہ اس کو پلانا۔ یہ کوئی کر سکتا ہے سوائے اس کے جس کے پیش نظر اللہ کا رشتہ ہو، جو زیر سایہ توحید عمل کر رہا ہو۔اس کے سوا کون کر سکتا ہے؟

توحضورِ والا! یہ مساوات زیر سایہ توحید قائم ہوئی ہے۔ اس احساسِ مساوات کا راز وحدتِ خالق کا پیغام ہے۔دنیا والے جو مساوات مساوات کا نعرہ لگاتے ہیں، وہ یہ سمجھے ہیں کہ یہ ضرب المثل ہے کہ اسلام دین مساوات ہے۔مگر قرآن کو میں دیکھتا ہوں،شروع سے آخر تک،تو مجھے زیادہ آیتیں یہ ملتی ہیں کہ یہ برابر نہیں ہے، یہ برابر نہیں ہے، یہ برابر نہیں ہے۔ برابر ہونے پر اتنا زور نہیں جتنا برابر نہ ہونے پر زور ہے۔ اگر میں صرف دو آیتیں دیکھوں تو اسلام مجھے دین عدم مساوات نظر آتا ہے۔

"لَا يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيرُ"۔

اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہے۔دھوپ اور سایہ برابر نہیں ہے۔

"هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ"۔

کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں؟ آبِ شور اور آبِ شیریں برابر نہیں ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس کی رد منظور ہے کہ کوئی کمالات کو نظر انداز کر کے سب کو ایک لکڑی ہنکائے۔اس لئے قدم قدم پر عدم مساوات کا اعلان ہو رہا ہے۔ لہٰذا مساوات کس معنی سے ہے اور کس معنی سے نہیں ہے، دیکھئے کتنا بڑا موضوع ہے

کہ اسلام دین مساوات ہے۔ان غلط امتیازات کے اعتبار سے جو دنیا والوں نے قائم کئے ہیں، ان خطوطِ امتیاز کو اسلام نے مٹایا۔غربت و دولت کو وجہ بلندی و پستی بتایا تھا، اُسے اسلام نے مٹایا۔نسبت کو معیارِ بلندی و پستی بتایا تھا، اُسے مٹایا۔ ملک کو بلندی و پستی کا معیار بتایا تھا، اُسے مٹایا۔رنگت کو معیارِ بلندی و پستی بتایا تھا، اُسے مٹایا۔ان سب کے مقابلہ میں مساوات قائم کی اور پھر اپنی طرف سے خطوطِ امتیاز کھینچے جو کردار پر مبنی ہیں،عمل پر مبنی ہیں، جو تقویٰ پر مبنی ہیں۔

"إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقٰكُمْ"۔

"تم میں سب سے زیادہ عزت اُس کی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے"۔

یہ مساوات ہے کہ مسجد کا مؤذن بلال حبشی کو بنا دیا جاتا ہے ۔ یہ بات خاندانی عربوں پر گراں گزرتی ہے کیونکہ احساساتِ جہالت مٹتے مٹتے مٹیں گے۔خو بو ایک دم سے نہیں بدلتی ہے۔مگر اب رسولؐ سے کیا کہیں کہ یہ تو حبشی ہے؟ کیونکہ ان کی زبان سے سنتے رہے ہیں کہ اسلام میں یہ تفرقے نہیں ہیں، لہٰذا اپنی ناگواری کا اظہار ایسے الفاظ میں ہو کہ ان کے مزاج کے مطابق ہو۔تو اب دل میں تو یہ ہے کہ یہ حبشی ہے، رسولؐ سے آکر کہا کہ یہ تو "اَسْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا الله" کہتے ہیں، "اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا الله" نہیں کہہ سکتے۔شین صاف نہیں کہتے۔ مَیں کہتا ہوں یقیناً کہا ہوگا۔ ہمارے ہاں فصاحت کے اظہار کیلئے یہ محاورہ ہے کہ فلاں شخص کا شین قاف درست ہے ، صاف ہے۔ وہ ضرور کہتے ہوں گے "اَسْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا الله"۔ سچی بات کہی مگر اپنے مطلب کے رنگ میں۔ یہ نہ سوچا کہ آخر پیغمبرؐ نے بھی تو کبھی بولتے سنا ہوگا، یہ انکشاف ہم کیا کر رہے ہیں؟ انہوں نے اپنے دل میں سوچا کہ یہ دلیل ایسی ہے کہ رسولؐ ضرور معزول کر دیں گے، اپنے فیصلے پر نظر ثانی

کریں گے کیونکہ ان کے نزدیک تو فیصلہ بشر ہی کا ہے۔

اب رسولؐ یہ نہیں کہتے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو، وہ تو "اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه" صاف کہتے ہیں۔ واقعاً نہیں کہتے تھے۔ رسول کیا جواب دیتے ہیں؟ فرماتے ہیں کہ:

"سِيْنُ بِلَالٍ شِيْنٌ عِنْدَ اللّٰه"۔

"بلال کا سین اللہ کے ہاں شین ہے"۔

فلسفہ کیا ہے؟ ہم تو ان کانوں سے سنتے ہیں، لہٰذا اس زبان سے جو لفظ نکلتا ہے، وہی ہماری سمجھ میں آتا ہے اور اللہ جو دل کی صدا سنتا ہے، لہٰذا ان کا سین وہاں شین ہو کر پہنچتا ہے۔ اب اس مؤذن بنانے کے فیصلے پر دنیا غور کرے۔ امامِ جماعت کو وہی دیکھے گا جو مسجد کے اندر جائے گا۔ مگر مؤذن کی صدا وہ بھی سنے گا جو رہگزر سے جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ بلال کو مؤذن بنانا نہیں تھا، یہ مساواتِ اسلامی کا ایک علم تھا جو بلند کیا گیا تھا۔

یہ تو مساوات ہوئی۔ عدم مساوات یہ ہے کہ جب بیٹی آتی ہے تو تعظیم کو کھڑے ہو جاتے ہیں، حالانکہ دنیا میں کوئی باپ بیٹی کی تعظیم نہیں کرتا۔ یہ تو عملِ رسولؐ بتاتا ہے کہ فاطمہؑ فقط بیٹی نہیں ہیں، کچھ اور ہیں۔ کوئی اور منزل ہے۔ فاطمہؑ کی منزل یہ ہے کہ رسولؐ کا عمل مردوں کیلئے نمونۂ عمل ہے اور فاطمہؑ کا کردار خواتین کیلئے نمونۂ عمل ہے۔ حضرت علی علیہ السلام تک کیلئے "فَاتَّبِعُوْنِيْ" کا پیغام ہے کہ میرے نقش قدم پر چلو۔ یعنی علیؑ کیلئے بھی رسولؐ کا نقش قدم نمونہ ہے۔ ان کا نقش قدم ان کے واسطے بھی اتباع کا مرکز ہے مگر فاطمہؑ کے نقش قدم کے آگے کسی کا نقش قدم نہیں۔

اس پہلو کی بناء پر ایک بڑی مشکل میرے ذہن کی حل ہوگئی کہ

امیر المومنین علیہ السلام کے فضائل بے شمار مگر میں نے کہیں نہیں دیکھا کہ پیغمبر خدا علی علیہ السلام کیلئے کھڑے ہوئے ہوں۔ لیکن فاطمہ زہراؑ کیلئے، صحاحِ ستہ کی حدیث ہے کہ پیغمبرؐ خدا تعظیم کو کھڑے ہوتے تھے۔ افضل شخص امیر المومنینؑ، ان کیلئے یہ بات نظر نہیں آتی اور فاطمہؑ زہرا کی تعظیم کیلئے رسولِؐ خدا کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ ان کی خصوصیت نظر آتی ہے۔ میں نے اس پر غور کیا تو بس یہی کچھ سمجھ میں آیا کہ کثرتِ فضائل الگ چیز ہے مگر عہدہ کے لحاظ سے علیؑ کا جو منصب ہے، وہ رسولؐ کے بعد ہوگا اور فاطمہؑ کا جو منصب ہے، وہ رسولؐ کے ساتھ ساتھ ہے۔ یہ ان کا کردار ہے جو خواتین کے طبقہ کیلئے نمونۂ عمل ہے، مثالِ عمل ہے۔

میں کہتا ہوں مقامِ اطاعت میں یہ رسولؐ کے پیچھے ہیں مگر مقامِ اتباع میں یہ رسول کے پیچھے نہیں ہیں، ان کی صف میں ہیں، ان کے ساتھ ساتھ ہیں اور اب کہتا ہوں کہ مقامِ عمل میں جو کام تیرہ معصومین نے مل کر کیا، وہ اپنے طبقہ کیلئے تنہا فاطمہؑ زہرا نے کیا۔

اب انہیں مثال پیش کرنا تھی تو جتنے بھی رشتے خواتین کے تقاضے کے ہوتے ہیں، ان سب کو انہیں نمونۂ مثال پیش کرنا تھا۔ ڈاکٹر اقبال نے تو عظمت و عزت کے لحاظ سے کہا ہے۔

مریمؑ از یک نسبت عیسیٰؑ عزیز
از سہ نسبت حضرتِ زہراؑ عزیز

وہ عزت کے لحاظ سے ہے۔ میں دوسرے رُخ سے ان کے اس تصور کو لیتا ہوں کہ حضرتِ مریمؑ مثالِ عمل حضرت عیسیٰؑ کی نسبت سے ہیں اور حضرت زہراؑ تین نسبتوں سے تین رشتوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔

ماشاء اللہ صاحبانِ فہم ہیں۔ میں نے جہاں تک غور کیا، عورت کی زندگی کے تین پہلو ہیں۔ ایک بیٹی ہونے کا دَور، دوسرے بیوی ہونے کا دَور، تیسرے ماں ہونے کا دَور۔ یہ تین دَور ہیں جو عورت پر گزرتے ہیں۔ عورت ہی بیٹی ہوتی ہے، عورت ہی زوجہ ہوتی ہے، شریکِ حیات ہوتی ہے، عورت ہی ماں ہوتی ہے۔ یہ ہیں تین دَور۔ میں کہتا ہوں کہ پہلا دَور بیٹی ہونے والا تمہیدِ حیات ہے۔ وہ بیچ کا دور ہے، وہ مقدمہ زندگی ہے، یہ نتیجہ زندگی ہے اور اصل زندگی کا درمیان کا دَور ہے اور وہی درمیان کا خانہ حضرت مریمؑ کے ہاں خالی ہے۔ وہ بے شک ماں باپ کی بیٹی ہیں۔ بے شک عیسیٰؑ ایسے بیٹے کی ماں ہیں لیکن وہ اصل زندگی نہیں ہے۔ شریک ِحیات ہیں ہی نہیں۔ لہٰذا اصل رہنمائی طبقہ خواتین کی نہیں کرسکتیں۔ میں کہتا ہوں کہ جس طرح عیسیٰؑ پر رسالت ختم نہیں ہوسکتی، اس لئے کہ وہ انفرادی زندگی کے نمائندہ ہیں، اسی طرح مریمؑ پر اس سلسلہ کی رہنمائی ختم نہیں ہوسکتی۔ جس طرح عیسیٰؑ کے بعد ہمارے پیغمبرؐ کی ضرورت تھی، اسی طرح مریمؑ کے بعد فاطمہؑ زہرا کی ضرورت تھی۔ انہوں نے تینوں رشتوں کیلئے مکمل مثالیں چھوڑیں۔ باپ کی شریکِ کار ہوکر مباہلے میں آئیں، شریکِ منصب نہیں کہہ رہا، شریکِ کار ہوکر باپ کے ساتھ مباہلے میں آئیں اور شوہر کے ساتھ ساری زندگی شریکِ کار رہیں اور ایسے بچے چھوڑے، حسنؑ وحسینؑ جیسے بیٹے، زینبؑ واُم کلثومؑ جیسی بیٹیاں۔

میں بارگاہِ سیدہؑ عالم میں خود دست بستہ عرض کروں گا کہ آپ بے شک مکمل نمائندہ ہیں۔ بے شک آپ نے ہر شعبے میں مثال چھوڑی ہے مگر اے معصومہؑ عالم! اے خاتونؑ جنت! اے مخدومہؑ دو جہاں! آپ کی سیرت کا نقص نہیں ہے مگر اللہ نے آپ کو کوئی بھائی نہیں عنایت کیا۔ اس رشتہ کے تقاضے آپ نہیں دکھا سکتی تھیں۔ لہٰذا جس طرح مریمؑ کے بعد آپ کی ضرورت تھی، اسی طرح آپ کے بعد آپ کی

بیٹی زینبؑ کی ضرورت تھی۔ اس رشتہ کا مکمل نمونہ حضرت زینبؑ کبریٰ، انہوں نے اس رشتہ کے تقاضے کربلا میں پیش کردیئے۔

مصائب

اربابِ عزا! میری کیا مجال کہ میں حضرت سید الشہداءؑ کی منزل پر کسی کو آگے بڑھاؤں، مگر جو واقعاتی فرق ہیں، وہ کیوں نہ عرض کروں کہ جنابِ سید الشہداء جس میدانِ جہاد میں تھے اور جس میدانِ امتحان میں تھے، تو ہر مصیبت میں زینبؑ ساتھ ساتھ شریک تھیں۔ کیا غربت کے شدائد مولاؑ نے برداشت کئے اور حضرت زینبؑ نے برداشت نہیں کئے؟ کیا روضہ رسولؐ سے روانگی کا صدمہ ہمارے امامؑ کو تھا اور ہماری شہزادیؑ کو نہیں تھا؟ میں کہتا ہوں کہ معتبر روایت تو حضرت سیدہؑ کے متعلق یہ ہے کہ بیت الشرف میں یعنی اپنے گھر کے اندر دفن ہوئیں۔ پہلے تو وصیت یہ کی تھی کہ رات کو میرا جنازہ اُٹھے مگر بعد میں تو جنازہ باہر لایا ہی نہیں گیا۔ بہت مستند روایت ہے، میں کہتا ہوں کہ مولاؑ کیلئے تو مجاز ہے کہ جب اُداس ہوتے ہوں گے تو رسولِ اکرمؐ کے سرہانے چلے جاتے ہوں گے یا ماںؑ کی قبر پر چلے جاتے ہوں گے لیکن زینبؑ کیلئے تو گھر کے اندر ماںؑ کی قبر تھی، لہٰذا اُن کیلئے ماںؑ کی قبر سے جدا ہونا بالکل حقیقت، تو کیا حسینؑ کو صدمہ تھا، اُن کو نہیں تھا؟ جب سے کربلا میں آئے، ساتویں سے پانی بند ہوا تو مولاؑ تشنہ لب رہے اور کیا بہن کے لب تر ہو گئے؟ بلکہ مولاؑ کی حد عطش عصر عاشورہ، مگر زینبؑ تو اس کے بعد بھی پیاسی رہیں اور بیبیاں اس کے بعد بھی پیاسی رہیں اور کونسا داغ امامؑ نے اُٹھایا ہے جس کو زینبؑ نے نہیں اُٹھایا؟ کیا عون ومحمد کا صدمہ انہی کو ہوا تو اُن کے بھانجے تھے، اُن کے بیٹے تھے اور عزیزوں کا جو اُن سے رشتہ تھا، وہ ان سے رشتہ تھا۔ حضرت عباس علیہ السلام کے جانے

سے مولاؑ کی کمر ٹوٹ گئی، زینبؑ کا کیا عالم ہوگا؟ مولاؑ کی کمر ٹوٹی اور زینبؑ کا دل ٹوٹ گیا عباسؑ کے جانے سے۔

اور علیؑ اکبر کا صدمہ کیا صرف حسین علیہ السلام کو ہوا اور اٹھارہ برس تک جس نے بڑی محنت سے پالا تھا، اُسے صدمہ نہیں ہوا؟ اور بس اہلِ عزا! حسینؑ نے تو فقط عباسؑ اور اُن کے بھائیوں کا داغ اُٹھایا اور زینب نے تو حسینؑ کا بھی داغ اُٹھایا۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت زینب سلام اللہ علیہا کے مصائب کو دیکھئے کہ جس پر سب کو قربان کر دیا، اُسے نہ بچا سکیں، اس سے بھی جدائی ہوگئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہر مصیبت میں حضرت زینبؑ بھائی کے ساتھ، مگر اہلِ عزا! جب بہن کے جہاد کا وقت آیا تو بھائی بظاہر ساتھ نہ تھا، اب بھائی کا سر تھا جو کربلا سے کوفہ، کوفہ سے شام تک بہن کے ساتھ چلا گیا۔ مگر بس ایک فرق اور یہ کہ یقیناً علیؑ اکبر نے بے مثل جہاد کیا، یقیناً عباسؑ نے بے نظیر جہاد کیا۔ ہمارے مولاؑ نے جب تلوار اُٹھائی تو اس حال میں بھی بے مثل جہاد کیا۔

یقیناً ہر ایک نے بے مثل جہاد کیا مگر خود ان حضرات کی بارگاہ میں عرض کروں کہ اے میرے مولا عباسؑ، اے میرے شہزادے علیؑ اکبر، اے میرے مولا حسینؑ! بے شک آپ نے بے نظیر جہاد کیا مگر جو جہاد آپ نے کیا، وہ خاندانی روایات کے مطابق تھا۔ حمزہ کے وارث یوں جہاد نہ کرتے تو کون کرتا؟ جعفر کے وارث یوں جہاد نہ کرتے تو کون کرتا؟ فاتح خیبر کے جانشین یوں جہاد نہ کرتے تو کون کرتا؟ مگر زینبؑ نے جو جہاد کیا، وہ خاندانی روایات سے الگ تھا۔ ارے جس کی ماں کی جنازہ رات کو اُٹھا ہو اور وہ روزِ روشن میں شہر بہ شہر۔۔۔

پانچویں مجلس

- یاد رکھئے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں عصمتِ کردار کا نام عدالت ہے، انبیاء وآئمہ کے ہاں عصمت ہے۔
- چونکہ انسان، انسان شناسی کی منزل سے دور تھا، اس لئے خدا شناسی سے دور تھا۔
- بسمل کا تڑپتا لاشہ دیکھا جا سکتا ہے، جسم پر زخموں کے نشان دیکھے جا سکتے ہیں، سر کو قلم دیکھا جا سکتا ہے، بہتا ہوا خون دیکھا جا سکتا ہے مگر کس راہ میں ہے، یہ آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا۔
- یاد رکھئے کہ ہر کمال کو کہہ دیا کہ ان کا ہے، ذاتی طور پر خدا سے بے نیاز ہو کر تو شرک ہے جب خدا کی طرف سے مان لیجئے تو عین توحید ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است برجریدۂ عالم دوام ما

اسلام اور ادیانِ عالم

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

"وَمَنۡ يَبۡتَغِ غَيۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِيۡنًا فَلَنۡ يُقۡبَلَ مِنۡهُ
وَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ"۔

جو اسلام کے علاوہ کوئی دین اختیار کرے گا، وہ اُس سے قبول نہیں ہوگا اور وہ آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔

یہ اس کا ترجمہ ہے۔ کوئی مفہوم اس کا ایسا نہیں کہ ترجمہ کچھ اور ہو اور مطلب اس کا کچھ اور ہو۔ ایک سوال اس موضوع سے متعلق مجھ سے کیا گیا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ سوال کچھ اور ذہنوں میں بھی موجود ہو۔ لہٰذا اس کی مختصر تشریح کر دوں۔ سوال یہ ہے کہ اسلام کے علاوہ کوئی دین قبول نہیں ہوگا۔ بہت سے غیر مسلم ہیں جو ایسے گھرانوں میں پیدا ہوئے کہ انہوں نے اپنے دھرم کے سوا کسی مذہب کی تعلیم سنی ہی نہیں۔ اسلام کی تعلیمات ان کے گوش زد ہوئے ہی نہیں۔ تو چونکہ ایک ماں باپ کے ہاں پیدا ہوئے تھے اور چونکہ ایک خاندان میں نشوونما پائی تھی، لہٰذا وہ اپنے اُسی مذہب پر آخر تک قائم رہے۔ اس گھر میں پیدا ہونا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس ماحول میں نشوونما پانا ان کے اختیار کی بات نہیں تھی۔ یہ اسباب ہوئے کہ مذہبِ حق سے روشناس نہ ہو سکے اور اپنے غلط مذہب پر آخر دم تک قائم رہے۔ ایسے افراد کیوں گھاٹا اٹھائیں؟ ان کو آخرت میں خسارہ کیوں ہو؟۔

یہ بہرحال ایسا سوال ہے جو اس موضوع کا ایک لازمی جزو ہے۔ اس بناء پر میں نے اس سوال کو موضوعِ بیان قرار دیا۔ اب اس سوال کے حل کرنے کیلئے تمہیداً یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسلام میں دو نقطہ نظر ہیں: ایک نقطہ نظر تو ان افراد کا ہے جو اللہ کیلئے عدالت ضروری نہیں سمجھتے جنہوں نے اصولِ دین کو عدالت سے محروم کر دیا ہے۔ ان کا تصور یہ ہے کہ اللہ قادرِ مطلق ہے۔ جب قادرِ مطلق ہے تو اس پر کسی کو پابندی عائد کرنے کا حق نہیں ہے کہ وہ ایسا ضرور کرے اور ایسا ہرگز نہ کرے۔ یہ پابندیاں عائد کرنا اس شخص کیلئے ہیں جو عاجز ہو، مجبور ہو اور کسی دوسرے کے زیرِ اختیار ہو۔ لیکن جو خود قادرِ مطلق ہے، اس پر یہ پابندیاں عائد کرنا کہ وہ ایسا ضرور کرے اور ایسا ہرگز نہ کرے، غلط ہے۔ لہٰذا چونکہ اس کی قدرت لامحدود ہے، اب جو شخص کوئی راستہ اختیار کرتا ہے تو اُسے قرآن سے بھی سند مل جاتی ہے۔ قرآن میں ہے:

"لَا يُسۡئَلُ عَمَّا يَفۡعَلُ وَهُمۡ يُسۡئَلُوۡنَ"۔

اس سے کوئی سوال نہیں ہوسکتا، جو وہ کرتا ہے کہ اس نے کیوں کیا۔ ہاں! دوسرے لوگوں سے یہ سوال کیا جائے گا کہ تم نے یہ کیوں کیا؟ خدا کے ہاں جب یہ ہے تو اس کے ہاں عدالت کی پابندی عائد کرنا صحیح نہیں ہے۔ یہ ان کا نقطہ نظر ہے جس کو میں نے پوری قوت سے بیان کیا۔ اب رَد اس کی مفصل عرض نہیں کرنا ہے۔ مجملاً یہ ہے کہ انہوں نے خدا کی قدرت کو سلاطین با اقتدار کی لاٹھی سمجھا ہے کہ جس کے ہاتھ میں لاٹھی، اُس کی بھینس۔ یہ وہ فلسفہ ہے جو طاقت کو حق سمجھتا ہو، یہ اس کا نظریہ ہے۔ چونکہ قادرِ مطلق ہے، لہٰذا جو چاہے کرے۔ تو سلاطین با اقتدار کی طاقت کا جو تقاضا ہوا کرتا ہے، اُسے اللہ پر مسلط کر دیا ہے۔ اب میں اپنے الفاظ

میں کہہ رہا ہوں۔ وہ ان کے الفاظ میں ترجمانی تھی۔ میں کہتا ہوں کہ چونکہ وہ قادرِ مطلق ہے، لہٰذا اس کی نہ داد نہ فریاد۔ وہ جو چاہے کرے۔ چنانچہ ان کے ہاں یہ ہے کہ اگر کوئی عمر بھر اطاعت کرے، بالکل ایک دفعہ بھی گناہ نہ کرے تو ممکن ہے کہ اللہ اُسے دوزخ میں ڈال دے اور جو عمر بھر نافرمانی کرتا رہے، اُسے جنت میں بھیج دے۔ اپنے منظورِ نظر افراد کو جنت میں بھیجنے کیلئے کیسے کیسے چور دروازے تلاش کئے ہیں۔

جناب! اتفاق سے اکثریت اس نظریہ کے حامی افراد کی ہے مگر اس نظریہ کی بنیاد پر تو اس سوال کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہے۔ اس نے کہہ دیا کہ جو اسلام کے علاوہ کوئی دین اختیار کرے تو وہ قبول نہیں ہوگا۔ چاہے بس ہو، چاہے بے بسی کے ساتھ ہو۔ جو اُس نے کہہ دیا ہے، اُسے مانیئے۔ اگر قرآن کو مانتے ہیں، اس نے چونکہ یہ کہہ دیا ہے، لہٰذا اس سوال کا محل ہی نہیں ہے۔ بالکل ٹھیک ہے، بالکل مجبور رہے، بالکل بے اختیار رہے، وہ بیچارہ ہے، اُس نے سنا ہی نہیں تھا مگر بہرحال اسلام کے علاوہ دوسرے راستہ پر ہے اور اُس کا کام ہے جنت اور دوزخ کو تقسیم کرنا اور اُس نے کہہ دیا ہے کہ ہم جنت میں اُسے بھیجیں گے جو مسلم ہو اور جو غیر مسلم ہوا، اُسے ہم ہرگز نجات نہیں دیں گے۔

تو اب چاہے وہ بے بس ہو، چاہے کچھ ہو، ہے تو غیر مسلم۔ تو اس کے فرمان کے مطابق اس کیلئے یہی انجام ہے جو قرآن نے کہہ دیا۔ یہ ان کے نقطۂ نظر سے ہے یعنی پھر کسی زحمتِ تفکر کے اٹھانے کی حاجت نہیں۔ سوچنے کی حاجت نہیں۔ بس کہہ دیا آپ کا کیا اجارہ ہے۔ وہ اُسے دوزخ میں بھیج رہا ہے۔ وہ چیخئے یا آپ فریاد کیا کیجئے۔ نہ اُسے حق چیخنے کا ہے، نہ آپ کو فریاد کرنے کا۔ یہ تو ان کے نقطۂ نظر سے ہے اور اکثریت اسی نقطۂ نظر کی ہے۔ وہ آسودہ ہے یعنی اس کو اس سوال کے

جواب کی کچھ زحمت نہیں اٹھانا مگر اس بارے میں ہماری ذمہ داری بہت زیادہ ہے کہ ہم اللہ کو عادل مانتے ہیں تو ہم لوگ عجیب مصیبت میں گرفتار ہیں۔ یہ کتنی کٹھن منزل ہے اور ہماری تو جتنی منزلیں ہیں، سب ہی کٹھن ہیں۔

صاحب! ہم ایسے ہیں کہ ہم کو اللہ کی وکالت بھی کرنا ہے، جب کوئی اس کی بات کرے اور ہمیں یہ محسوس ہو کہ یہ اللہ کی بلندی کے خلاف ہے تو ہمیں اللہ کی طرف سے بھی وکالت کرنا ہے۔ آدمؑ سے لے کر نبی تک ہر نبی کی وکالت کرنا ہے۔ آدمؑ کے دامن پر گناہ کا دھبہ آئے تو صفائی کیلئے ہم بڑھیں۔ یوسفؑ کے دامن پر کوئی دھبہ آئے تو ہم بڑھیں۔ سب کے وکیل ہم ہیں۔ ہم پر ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کے ثبوت کا بار ہے۔

اپنے آئمہؑ کیلئے ظاہر ہے کہ ہمیں ہی آگے بڑھنا ہے۔ جی نہیں! گناہ نہیں ہے۔ کسی نہ کسی رُخ سے ہمیں ثابت کرنا ہے کہ یہ گناہ نہیں ہے۔ وہ بہرحال معصوم ہیں۔ دنیا یہاں بھی آسودہ ہے یعنی کسی مسئلہ میں بحث کی ضرورت ہی نہیں۔ کہیں کسی نبی کے کردار پر اعتراض ہو تو کہیں گے کہ گناہ کیا تو کیا ہوا، آدمی ہی تو تھے! ہمارے لئے بڑی مصیبت ہے۔ ہمیں اس مصیبت میں اعتماد نے ڈالا۔ انہیں مصیبت سے رہائی دی، اپنی طرف کمزوری کے احساس نے۔ ہمارے اعتماد نے ہم کو مصیبت میں یوں ڈالا کہ ہم جنہیں مان رہے تھے، ان کے متعلق یہ بھروسہ تھا کہ ان کے دامن پر کوئی داغ نہیں ہے۔ لہٰذا ہم نے جب وصیٔ نبی کو اس منزل پر مانا تو وہ رسول جس کے یہ جانشین ہوں، اُسے کیونکر گناہگار مان سکتے تھے۔

دیکھئے! ہم ادھر سے چلے ہیں کہ جب یہ معصوم ہیں تو ناممکن ہے کہ انبیاء و مرسلین گناہگار رہوں۔ لہٰذا اس تصور نے کہ یہ معصوم ہیں، اس اعتماد نے ہم پر ایک لاکھ چوبیس ہزار عصمتوں کا بوجھ ڈال دیا اور جب انبیاءؑ معصوم ہیں، اللہ کے ہاں ایسی

بات کیونکر ہو سکتی ہے کہ جو اس کے معیارِ عظمتِ کردار کے خلاف ہو۔ یاد رکھئے کہ اللہ کے ہاں عظمتِ کردار کا نام عدالت ہے، انبیاء وآئمہ کے ہاں عصمت ہے۔

پس ہم اللہ کیلئے بھی وکالت پر مجبور ہو گئے۔ یہاں سے ہم چلے تھے، وہاں پہنچے۔ وہ بھی یہیں سے چلے اور نہ جانے کہاں پہنچے؟ ایسے افراد سے مجھے ہمدردی ہے۔ انہیں ایسے اشخاص کو بلندی دینا ہوئی یا ماننا پڑی کہ جن میں داغ دھبے ہیں۔

اب نگاہ میں یہ ہے کہ رسول کا جانشین ہے اور یہ ایسا ہے۔ اس بات کی اہمیت کو نگاہ میں کم کرنے کیلئے یہ کہا کہ اس کا کیا ذکر ہے، اس کیلئے ضرورت ہی کیا ہے کہ وہ معصوم ہو؟ گویا ضمیر گوارا نہیں کرتا مطلق طور پر کہنے کو کہ انبیاء معصوم نہیں ہیں۔ جی ضرور معصوم ہیں مگر اس میں ایک مگر آجاتا ہے۔ معصوم ہیں مگر قبل بعثت نہیں ہیں یا یہ کہ وہ جو ارادہ گناہ ہوتے ہیں، اس کے لحاظ سے معصوم ہیں۔ مگر ان سے سہو ونسیان سے گناہ ہو جاتے ہیں۔ غرض یہ کہ ایک عدد "مگر" ضرور آجاتا ہے۔ بس انسان کو یہ سہارہ ہو جاتا ہے کہ جب رہنما میں یہ باتیں ہیں تو کوئی بات نہیں ہے۔ لہٰذا جب نبی کی سطح یہ مان لیں گے تو ظاہر ہے کہ "وزیرے چنیں شہریارے چنیں"۔ جب انبیاء کے ہاں عصمت پوری مکمل ضروری نہیں تو اللہ کے ہاں عدالت پوری مکمل کیوں ضرورت ہو؟ وہ جو چاہے کرے۔

مگر اب ہم ہیں سب کے وکیل۔ ہمیں سب کی نمائندگی کرنا ہے۔ ہم اللہ کو عادل سمجھتے ہیں تو عدالتِ الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ شخص جو اس ماحول میں پیدا ہو، اس ماں اور باپ کے ہاں پیدا ہو، اگر بالفرض ایسا ہو، حالانکہ اس دَورِ تمدن و تہذیب اور کثرتِ روابط وتعلقات میں ایسا ممکن نہیں ہے لیکن بالفرض کوئی ایسا ہو کہ کچھ گوش زد ہی نہ ہوا ہو، اس کو اپنے مذہب کے سوا، اس کے ذہن میں کبھی آیا ہی نہ

ہو کہ کوئی مسلم بھی قوم ہے، اُسے پتہ ہی نہ چلا ہو کہ اسلام بھی کوئی چیز ہے اور اس نے آنکھ کھول کر جیسے کال کوٹھڑی میں، بس تاریکی ہی تاریکی دیکھی۔ اس نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو بس اپنے مذہب کو پایا۔ اس تک صدائے حق پہنچی ہی نہیں۔ اس تک نام اسلام گیا ہی نہیں۔ اس نے رہنمایانِ اسلام کا نام کبھی سنا ہی نہیں۔ اس کے ذہن میں کبھی یہ شبہ پیدا ہوا ہی نہیں کہ شاید اسلام حق ہو۔ کبھی اس کے ذہن میں یہ تصور ہی نہیں ہوا کہ ممکن ہے کوئی دوسرا راستہ اسلام ہی نہیں، عیسائیت حق ہو، یہودیت حق ہو۔ ایسی کوئی بات اس کے ذہن میں آئی ہی نہیں۔

اگر بالفرض ایسی مخلوق پائی جاتی ہو، ایسا آدمی موجود ہو تو چونکہ خدا ہمارا عادل ہے، تو اس کو ہرگز سزا اس کے کفر کی نہیں ملے گی اگر وہ واقعی مجبور تھا۔ لیکن اگر اُس نے سب نام دوسرے مذاہب کے سنے اور پھر بھی دماغ آسانی کی بناء پر، ذہنی کاہلی کی بناء پر اپنے سابق مذہب سے محبت کی بناء پر، اپنی آبائی روایات سے اُنس کی بناء پر، اس کی وجہ سے اس نے کبھی سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی کہ کوئی دوسرا مذہبِ حق ہے، تو پھر ایسا منکر اپنی کسی اختیاری کوتاہی کی بناء پر قابل معافی نہیں ہے۔ جب بہت سے راستے اس کے گوش زد ہوئے تو کیا رسولؐ کی آواز سننے کی ضرورت نہیں تھی؟ قرآن کی آیتیں پہنچنے کی ضرورت نہیں تھی اس تک کہ کوئی حافظِ قرآن جاکر اُسے قرآن سنائے یا کسی عالم کی ضرورت نہیں تھی کہ جاکر اُسے حدیثیں سنائے، جاکر اُسے رسولؐ کا پیغام سنائے۔

اس کی جو عقل تھی، وہ اس کی طرف کا رہنما تھی جو اس پر یہ فریضہ عائد کرتی تھی کہ تم کو خود تحقیق کرنا چاہئے۔ جب بہت سے راستے ہیں تو تم کو تلاش کرنا چاہئے کہ کونسا راستہ صحیح ہے اور اگر ایسا نہیں کیا تو وہ اس رہنما کی نافرمانی کی وجہ سے ہے جسے خالق نے اسی لئے رکھا تھا۔

اس نے اس رہنما کو عقل کی صورت میں ہر ایک کے اندر رکھ دیا تھا۔ اس رہنما کی وجہ سے یہ اب موردِ عتاب ہوسکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو حق ہے کہ وہ اُسے سزا دے کہ گوش زد تو ہوا اسلام کا نام تو پھر تم نے معلوم کیوں نہ کیا کہ اسلام کیا چیز ہے؟ پھر تم نے دریافت کیوں نہ کیا کہ اسلام کسے کہتے ہیں؟ اور یہ وہ کافر ہی نہیں ہیں، بہت سے مسلمان ہیں جو عمر گزر جاتی ہے، نماز صحیح نہیں پڑھتے، اس لئے کہ بیچاروں کو مسئلے معلوم نہیں ہیں، اس لئے کہ مسئلے معلوم کرنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ عالم مل بھی گیا تو اس سے پوچھیں گے کہ فلاں امام کی کتنی لڑکیاں تھیں؟ اس سے یہ پوچھیں گے کہ فلاں شہزادے کی کتنی عمر تھی؟ یعنی سب کچھ وہ پوچھیں گے جس سے اپنے عمل کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن جو اپنا عمل ہے، اُسے کبھی نہیں پوچھیں گے کہ وضو کس طرح کریں تو صحیح ہوگا۔ غسل کس طرح کریں تو صحیح ہوگا۔ نماز کس طرح پڑھیں تو صحیح ہوگی۔

تو یہ ہے تو سہی کہ کہیں بیچارے جاہل ہیں، بیچارے ناواقف ہیں لیکن ان کیلئے تو معصوم نے صراحتاً کہا ہے کہ روزِ قیامت اُسے بلائیں گے اور اس سے کہیں گے کہ تو نے صحیح عمل کیوں نہ کیا؟ وہ جواب میں کہے گا کہ مجھے علم نہیں ہوا۔ ارشاد ہوگا کہ تم نے علم حاصل کیوں نہ کیا؟ تم نے مسائل سے واقفیت حاصل کیوں نہ کی؟ اس کے بعد کوئی جواب نہیں۔ تو جو ذرائع کے نہ موجود ہونے کی وجہ سے مجبوراً غلطی پر رہے۔ اس کو جاہل قاصر کہتے ہیں۔ وہ جاہل قاصر ہے اور اسے جاہل مقصر کہتے ہیں۔ قصوروار۔ یعنی بہ اختیار خود تقصیر کرنے والا جاہل۔ یہ معاف نہیں ہے۔ تو کافر اگر قاصر میں داخل ہو تو اُسے سزا نہیں مل سکتی لیکن اگر وہ مقصر میں داخل ہے تو اس دورِ تمدن و تہذیب میں کوئی ایسا آدمی سوچنا مشکل ہے کہ جس تک آوازِ اسلام پہنچی ہی نہ ہو۔ جس نے نامِ اسلام سنا ہی نہ ہو۔ آجکل ذرائع کی اتنی وسعت ہے، لوگ اخبار

پڑھتے ہیں۔ اس میں نام آتے ہیں۔ ریڈیو سنتے ہیں، اس میں نام آتے ہیں۔ ٹی وی پر مختلف لوگوں کے جلوس تفریحاً دکھائے جاتے ہیں۔ مگر اس سے اللہ کی حجت ہر ایک پر ہوتی رہتی ہے۔ لہٰذا اس دور میں اس قسم کے کافر کا وجود نہیں ہے جس نے نامِ حق سنا ہی نہ ہو۔ اس صورت میں آجکل تو یہ کلیہ ہے:

"وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ"۔

جو اسلام کے علاوہ کسی دین کو اختیار کرے یا کسی دین پر قائم و برقرار رہے، وہ ہرگز قبول نہیں ہوگا اور آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوگا اور حق بجانب طور پر ہوگا کیونکہ اس نے عملی کوتاہی کی۔

ہاں! فرض کیجئے کہ ذوقِ تخلیق پیدا ہوا مگر مذاہب اتنی کثرت سے ہیں کہ وہ تحقیق میں مصروف ہوگیا لیکن منزل تک نہ پہنچ سکا تو اب فقط یہ کہ سزا سے بچے گا بلکہ اس کی جدوجہد کا اجر بھی ملے گا۔

اتنا بیان تو اس سوال کی خاطر ہوا۔ اب اسلام کی خصوصیات پر آئیں۔ پہلی خصوصیت یہ کہ اس کا تعلق کسی محدود فرد یا محدود جگہ سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ذاتِ الٰہی سے ہے۔ لامحدود پیغام ہے اور ایسی ذات کی طرف سے ہے جس سے کوئی بیگانگی کا اعلان نہیں کرسکتا کہ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا اس میں صلاحیت خود اس کے نام میں ہمہ گیر ہونے کی ہے۔

دوسری خصوصیت یہ کہ اسلام دینِ کائنات ہے اور اسلام دینِ فطرت ہے۔ کوئی الگ سے بار نہیں ہے جو انسان پر عائد ہوتا ہو بلکہ وہی فطرت کا تقاضا جو ہے، اسی کا مطالبہ ہے یعنی جب پیدا ہوا تھا، جب بھی قانونِ الٰہی کی اطاعت کرتا

ہوا آیا تھا اور اسی کی اطاعت کا نام اسلام ہے۔ یہ ایک مفہوم اس حدیث کا ہے۔ کلامِ رسولؐ کی خصوصیت یہ ہے کہ کتنے ہی پہلو اس میں ہوتے ہیں اور کتنے ہی معنی اس میں پیدا ہوتے ہیں۔ ارشادِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے:

"كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلٰى فِطْرَةِ الْاِسْلَامِ اِنَّمَا اَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ اَوْ يُنَصِّرَانِهٖ اَوْ يُمَجِّسَانِهٖ"۔

ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ یہ ماں باپ ہیں جو اُسے یہودی بنا دیتے ہیں یا یہودی رکھتے ہیں یا نصرانی بنا دیتے ہیں یا نصرانی رکھتے ہیں اور آتش پرست۔

یہ نام بھی بطورِ مثال ہیں کہ جو کوئی کسی غلط راستے پر قائم ہوتا ہے، سوائے اسلام کے، وہ درحقیقت ماحول کا دباؤ ہے جیسے یہودیت، نصرانیت بطورِ تمثیل نام ہیں۔ ویسے ہی ماں باپ کا نام بطورِ تمثیل ہے۔ ماں باپ کے معنی صرف ماں باپ ہی نہیں ہیں بلکہ جو ماحول، جو بزرگ جس کے زیرِ سایہ اس نے نشوونما پائی ہو، وہ اس میں مضمر ہیں۔ درحقیقت وہ اسے غلط راستوں پر لگا دیتے ہیں۔ یہ حدیث میں نے پڑھی کہ ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے اور تربیت یا ماحول اُسے غلط راستے پر چلاتا ہے۔ تو جہاں تربیت فطرت سے ہم آہنگ ہو، اس کے متعلق اس سوال کی گنجائش کب ہوگی کہ کب اسلام لایا۔

وہ بچہ جس کے بچپن کی بناء پر سوال ہوتا ہے کہ چونکہ بچہ ہے، لہٰذا اس کے اسلام کی کیا اہمیت ہے۔ مگر اتفاق سے وہ بچپن ہی اس کا جوہر ہے۔ مجھے بھی بچے کو بوڑھا بنانے کا شوق نہیں ہے۔ جو بچہ ہے، وہ تو بچہ ہی ہے لیکن یہ کہ وہ بچہ ایسا ہے کہ پیغمبر کے زیر تربیت ہے۔ اس سے اس کی قدرتِ ادراک بھی نمایاں ہوتی

ہے۔ یعنی جو مربی عالم بننے والا ہے، اس کے آفتابِ تربیت کی تمام شعائیں اس ایک شخص پر مرتکز ہیں۔

کس طرح وہ ہر وقت ان کے ساتھ رہتے تھے۔ ہمارے اُردو ادیبوں کے ذہن پر یہ تشبیہ بار ہو سکتی ہے کہ اُردو میں اسے نظم کیا جائے تو وہ خوبصورت شعر نہیں ہوگا۔ لیکن کمالِ تشبیہ کا انحصار ماحول پر ہے۔ عرب کا ماحول، اس میں حضرت علی علیہ السلام، جن کی فصاحت و بلاغت کیلئے اُدباء کا مقولہ یہ ہے کہ تحت کلام خالق وفوق کلام مخلوق۔ خالق کے کلام کے نیچے ہے اور تمام مخلوق کے کلام کے اوپر ہے۔ امیرالمومنین یہ تشبیہ ارشاد فرماتے ہیں:

"میں اس طرح پیغمبرؐ کے پیچھے پیچھے رہتا تھا جیسے اونٹنی کا بچہ اونٹنی کے پیچھے پیچھے رہتا ہے"۔

اب اس بچپن میں جبکہ ہر وقت مربی پیچھے پیچھے رہتے ہیں، قوتِ ادراک و احساس کیا ہے کہ فرما رہے ہیں:

"كُنْتُ اَرَا نُوْرَ نُبُوَّةِ وَاَشُمُّ رِيْحَ الرِّسَالَةِ"۔

"میں نبوت کی روشنی میں دیکھتا تھا اور رسالت کی خوشبو سونگھتا تھا"۔

کوئی کہے کہ رسالت کی خوشبو ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ قرآن میں پڑھ کر آپ بتائیے کہ کیا قمیضِ یوسف کی کوئی خوشبو تھی؟ جیسی خوشبو ہوتی ہے، ویسا مشام چاہئے۔ پھولوں کی خوشبو جسمانی مشام والے سونگھیں گے اور نبوت کی خوشبو وہ ہے جو نبوت کے ہم جنس منصب کا کوئی آدمی سونگھے۔

میں نبوت کی روشنی دیکھ رہا تھا اور رسالت کی خوشبو سونگھ رہا تھا۔ نبی کی خوشبو نہیں کہہ رہے ہیں، رسول کی خوشبو نہیں کہہ رہے ہیں۔ جی نہیں! جو جوہر ان میں

ہے، نبوت کی روشنی اور رسالت کی خوشبو۔ تو جو قبل رسالت، قبل بعثت نبوت کی روشنی دیکھتا اور رسالت کی خوشبو سونگھتا ہو، اس کیلئے پوچھئے گا کہ کب ایمان لایا اور اس نے کب اسلام اختیار کیا۔ رسول کی بعثت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ چالیس برس کی عمر میں مامور ہوئے بلکہ چالیس سال کی عمر میں اعلانِ رسالت کا حکم ہوا۔ دعوائے رسالت پر مامور ہوئے ورنہ نبی تو پہلے سے تھے۔ میں اس کی روشنی میں کہوں گا کہ تاریخ کی نگاہ مشاہدات کو دیکھتی ہے۔ ایمان کا تعلق غیب سے ہوتا ہے۔

اس لئے تاریخ میں یہ ہے کہ ستائیس رجب کو ۴۰ عام الفیل میں رسول مبعوث بہ رسالت ہوئے۔ یہ تاریخ والی رسالت ہے اور حقیقت کے لحاظ سے رسالت:

"كُنْتُ نَبِيًّا وَّاٰدَمُ بَيْنَ الْمَاءِ وَالطِّيْنِ"۔

"میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدمؑ کا پتلا آب وگل میں تھا"۔

بس میں کہتا ہوں کہ جس نوعیت کی رسالت ان کی تھی، اس نوعیت کا علیؑ کا ایمان تھا اور جس معنی سے یہ آج رسولؐ ہوئے، اس معنی سے یہ آج ایمان لائے۔

فطرت آغازِ عمر انسانی سے جو عمل کرواتی ہے، اس کا نام اسلام ہے۔ بعد میں الگ سے کوئی بوجھ نہیں پڑنا ہے، کوئی دباؤ نہیں پڑنا ہے۔ جو کام اب تک جبری طور پر کرتے رہے ہو، اب اختیاری طور پر کرو۔ اس کی اطاعت اب تک برابر کر رہے تھے مگر اپنے شعور ادراک سے نہیں کر رہے تھے۔ اب شعوری طور پر اپنے اختیار و ادراک کے ساتھ اس کی اطاعت کرو۔ اس کے پیغام کو قبول کرو تو اس کا نام آئینی اسلام ہوگا۔ وہ حقیقی قدرتی اسلام تھا، یہ اختیاری اپنے عمل کا اسلام ہوگا جو اس وقت سے تم اختیار کرو گے۔ اس لئے اُس وقت کی اطاعت کی کوئی جزا نہیں ہوگی۔ اس وقت جو اطاعت کرو گے، اس کی تمہیں جزا بھی ملے گی اور جزا کا

دینا بھی فضل و کرم ہے ورنہ مخالفت میں سزا ہے، موافقت میں جزا کا استحقاق دنیا میں نہیں ہوا کرتا۔ یہ اس کا کرم ہے کہ اس نے موافقت میں جزا کا اعلان کیا۔ یہاں تک کہ جو گناہوں سے توبہ کرے، توبہ کے معنی یہ ہیں کہ غلط راستے سے صحیح راستے پر آئے۔ تو یہ نہیں ہے کہ وہ سزا ختم ہو جائے گی جو گناہوں کی تھی بلکہ یہ توبہ کرنا بھی ایک حسنہ ہے، ایک نیکی ہے جس کی جزا ملے گی۔

تیسری خصوصیت اسلام کی یہ ہے کہ اسلام نے انسان کو انسان سے متعارف کروایا۔ یعنی دنیا کے سامنے اس سے پہلے دور دور کی چیزیں تھیں مگر یہ نہ سمجھا تھا کہ انسان کیا چیز ہے۔ انسان شناسی کی منزل دور تھی۔ چونکہ انسان، انسان شناسی کی منزل سے دور تھا، اس لئے خدا شناسی سے دور تھا۔ ایک معنی اس کے یہ ہیں کہ "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ"، جس نے اپنے کو پہچانا کہ میں کون ہوں۔ وہ اپنے پروردگار کو بھی پہچان لے گا کہ وہ کیا ہے۔ بعض جگہ ہے کہ یہ کلامِ رسولؐ ہے۔ بعض جگہ یہ ہے کہ یہ کلامِ امیرالمومنین ہے۔ بعض جگہ بلند حکماء کے نام ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ جملے کے بلند قیمت ہونے کا ثبوت ہے کہ ہر بڑے آدمی پر پورا اترتا ہے۔ جنابِ امیرالمومنین کا کلام ہو، تب بھی بالواسطہ رسولؐ کا کلام ہے اور خود رسولؐ کا ہے تو رسولؐ کا ہے ہی۔ بہرحال جو اپنے کو پہچانے کہ میں کون ہوں، اس کے بہت سے رُخ ہیں اور کلامِ رسولؐ کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک جملہ ہوتا ہے اور اس میں معنی کے دفتر پنہاں ہوتے ہیں۔

"مَنْ عَرَفَ"، جو اپنے کو پہچانے، اس کو میں اُردو کے الفاظ میں یوں کہوں گا کہ خود شناسی خدا شناسی کا ذریعہ ہے۔ یہ کیونکر ہے؟ انسان نے یہ نہ سمجھا کہ انسان کیا ہے؟ اس لئے پتھروں کے سامنے جھکا۔ انسان نے یہ نہ جانا کہ انسان کیا ہے، لہٰذا درختوں کے سامنے جھک گیا۔ انسان نے یہ نہ جانا کہ انسان کیا ہے، لہٰذا

اپنے جیسے انسانوں کے آگے جھک گیا اور اپنے ایسے انسانوں کے آگے جھکا تو اگر جھکنا ہوتا تو گھر والوں کے سامنے کیوں نہ جھکا؟ اپنے محلے والوں کے سامنے کیوں نہ جھکا، خود اپنے سامنے کیوں نہ جھکا؟ جس انسان کے سامنے جھکا، اگر دولت مند کے سامنے جھکا تو انسان کے سامنے جھکنا نہیں ہے۔ اس دولت کے سامنے جھکنا ہے۔ اگر سلطان کے سامنے جھکا تو وہ انسان کے سامنے جھکنا نہیں ہے، سلطنت کے سامنے جھکنا ہے۔ اس نے کسی صاحبِ قوت کے سامنے جھکنا اختیار کیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی قوتِ بازو کے سامنے جھکا۔ وہ انسان کے سامنے جھکنا نہیں ہے اور انسان کے سامنے نہ جھکنے کا نتیجہ ہی ہے کہ انسان مرکز قربانی میں دھوکہ کھانے لگا کہ کس کی راہ میں اپنے آپ کو صرف کرے۔ اس لئے عمر گزاری دولت کے حاصل کرنے میں تو دولت پر جان دینے لگا۔ عمر گزاری شہرت حاصل کرنے میں تو شہرت پر جان دینے لگا۔ عمر گزاری کسی منصب کے حاصل کرنے میں تو منصب پر جان دینے لگا۔ اصولِ دین میں خداشناسی کی منزل سے دور ہوا، انسان ناشناسی سے اور کردار کی منزل میں غلط مصارفِ حیات میں اپنے جوہر کو صرف کرتا رہا۔

یہ بھی انسان کے نہ پہچاننے کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ سمجھتا کہ یہ انسان کیا ہے تو پہاڑوں کے سامنے نہ جھکتا، درختوں کے سامنے نہ جھکتا، حیوانوں کے سامنے نہ جھکتا، صاحبِ قوت، صاحبِ طاقت، صاحبِ زر کے سامنے نہ جھکتا۔ پھر ڈھونڈتا اُسے جو اس سے اونچا ہوتا تاکہ اس کے سامنے جھکے اور اپنے سے اونچا سوائے اپنے خالق کے کوئی اور نظر نہ آتا تو چاہے وہ نام نہ لے سکتا مگر اسی کے سامنے جھکتا اور اس کے سوا جو سامنے آتا، اس کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیتا۔ یاد رکھئے غیروں کا انکار، یہ بھی مرکز توحید ہے ورنہ کلمے کی ابتداء نفی سے نہ ہوتی، مثبت سے ہوتی۔

اس لئے صرف انسان کو پہچاننے سے چاہے نام کے ساتھ اللہ تک نہ پہنچتا

مگر لا الٰہ کی منزل کو تو طے کر ہی لیتا۔ اگر اِلّا کہہ کر چاہے چپ ہو جاتا مگر زبانِ بیان چپ ہوتی، دل کی آواز چپ نہ ہوتی۔ دل اسی کی طرف مڑتا جو اِن سب سے بالاتر ہو اور وہ اللہ ہے اور اس کو ماننا کوئی کام کا محتاج نہیں ہے۔ ضمیر کسی کا نام نہیں ہوتا۔ وہ کہوں تو قبل میں جب تک ذکر نہ ہو تو پتہ نہیں چلے گا کہ "وہ" کون ہے۔ لیکن صرف اللہ وہ ہے کہ جس کے ناموں میں "ھُوَ" ہے یا:

"ھُوَ یَامَنْ لَا یُعْرِفُ اِلَّاھُوَ۔ یَامَنْ لَا یَعْلَمُ مَنْ ھُوَ اِلَّاھُوَ"۔

اے وہ۔ یہ ان کیلئے ہے جو نام نہ لے سکتے ہوں۔ صرف اشارۂ ذہنی کر سکتے ہوں۔ اب یہاں ایک جملے میں شروع والے سائل کا جواب کہ مَیں کہتا ہوں کہ اسلام کا نام اس بیچارے تک نہیں پہنچا، اس لئے اللہ اسے نہ آیا۔ لیکن "وہ" کا اشارہ تو اندر سے بلند ہوگا تو "وہ" کو مانا اور مسلم ہوا:

"وَمَنْ یَبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُقْبَلَ مِنْہُ"۔

"جو اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرے گا تو وہ قبول نہیں ہوگا"۔

اگر اپنے کو جان لیتا کہ میں کون ہوں تو منزلِ توحید تک پہنچ جاتا اور اگر اپنے کو جان لیتا کہ میں کیا ہوں تو مقصدِ قربانی میں غلطی نہ کرتا۔ ہر چیز اپنے سے بالاتر کی خاطر قربان ہوتی ہے۔ زر و جواہر کی خاطر اس نے جان دی تو زر و جواہر کیا ہیں؟ پتھروں کا ذخیرہ۔ اصل دولت سونا ہے اور سونا جمادات میں داخل ہے۔ یہ رنگسازی کی بات ہے کہ سرخ رنگت اسے دی ہے تو اس کا نام سونا ہو گیا۔ مگر حقیقت کے لحاظ سے جو ٹھوکروں میں آنے والے پتھر ہیں، وہی سونا، وہی چاندی، وہی لعل و جواہر ہیں۔

حقیقت کے لحاظ سے جمادات ہیں۔تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر دولت کی خاطر جان دی تو اپنے سے تین زینے اُتر کر قربانی پیش کی۔تو اگر شہرت کی خاطر جان دی تو شہرت ہے بے اصل چیز۔وہ کوئی اصلیت رکھتی ہی نہیں۔اور اگر عہدہ کی خاطر جان دی تو عہدہ امر اعتباری ہے۔امر اعتباری کا مطلب یہ ہے کہ جب تک لوگ سمجھ رہے ہیں اور سمجھنا چھوڑ دیا تو نہ رہا۔مثلاً ممبر ہے، منبر نہیں۔یہ منبر وجودِ اصلی رکھتا ہے اور وہ ممبر وجودِ اختیاری رکھتا ہے۔جب تک سمجھ رہے ہیں ممبر ہے اور جب سے سمجھنا چھوڑ دیا، تب سے آدمی رہ گیا، ممبر نہ رہا۔جب سمجھ رہے ہیں چیئر مین ہے، جب سے لوگوں نے سمجھنا چھوڑ دیا، آدمی رہ گیا، چیئر مین نہ رہا۔

اور حضورِ والا! وزیر ہے، جب تک سمجھا گیا کہ وزیر ہے، جب سے سمجھنا ختم ہو گیا، اس وقت سے وزیر نہ رہا۔کوئی کہیں کا صدر ہے، جب تک لوگ سمجھ رہے تھے، تب تک قرار داد تھی، اس وقت تک صدر رہا اور جس وقت سے قرار داد بدل گئی، اس وقت سے صدارت ختم ہو گئی، آدمی رہ گیا اور صدر نہ رہا۔

سرکارِ والا! عہدہ چلا گیا تو پھر آدمی رہ گیا، عہدہ نہ رہا۔یہ اس وقت ہے جب عہدہ ملنے کے بعد آدمی رہا ہو۔اگر عہدہ ملتے ہی آدمی کو رخصت کر دیا ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جب عہدہ گیا تو نہ عہدہ رہا، نہ آدمی رہا۔بس آدمی کا مجسمہ رہ گیا اور کچھ نہ رہا۔سرکار! مرکز قربانی کا غلط استعمال انسان ناشناسی کا نتیجہ ہے۔اگر سمجھتا کہ انسان کیا چیز ہے تو مرکز قربانی اسی کو بناتا جو اس سے بالاتر ہوتا اور اس سے بالاتر سوائے خالق کائنات کے کوئی چیز نہیں ہے۔لہٰذا اسی کی راہ میں قربانی پیش کرتا۔اسی لئے قرآن مجید نے کہیں نہیں کہا کہ جو قتل ہوئے ہیں، انہیں زندۂ جاوید سمجھو۔ ہر جگہ کہا:

"اَلَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ"۔

جو قتل ہوئے اللہ کی راہ میں۔قتل ہونا آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے، اللہ کی راہ آنکھوں سے نہیں دیکھی جا سکتی۔بسمل کا تڑپتا لاشہ دیکھا جا سکتا ہے، جسم پر زخموں کے نشان دیکھے جا سکتے ہیں، سر کو قلم دیکھا جا سکتا ہے، بہتا ہوا خون دیکھا جا سکتا ہے مگر کس راہ میں ہے، یہ آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا۔اسی لئے ضرورت ہے کہ جب آدمی جان دے تو کسی ایسے کی اجازت سے دے کہ حدِ امکان تک ضمانت ہو کہ یہ جان اکارت نہیں جائے گی، سوارت ہوگی۔اسی لئے شریعتِ حقہ میں جہاد مشروط ہو گیا۔یا امام ہو یا نائبِ امام ہو، ان کی اجازت جب تک نہ ہو، اس وقت تک جنگ ہوگی، جہاد نہیں ہو سکتا۔کوئی ضمانت تو ہو کہ ہمارا خون رائیگاں نہیں جائے گا بلکہ کسی محفوظ ذخیرے میں جا رہا ہے۔جب اس طرح جائے تو جان گئی، نہیں رہی، حیاتِ فانی بدل گئی، حیاتِ باقی کے ساتھ اور یہ عمل مجازی نہیں ہے۔

ہرگز نمیرد انکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

یہ وہ شاعرانہ زندگی نہیں ہے بلکہ یہ وہ زندگی ہے کہ آثارِ زندگی قرآن نے مرتب کئے ہیں۔اگر فقط اتنا ہوتا:

"لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَآءٌ"۔

"وہ جو راہِ خدا میں قتل ہوئے ہیں، انہیں مردہ نہ سمجھو بلکہ زندہ ہیں"۔

کوئی کہتا یہ وہی حیاتِ جاودانی ہے جو کارناموں کے ساتھ ہوتی ہے۔ راہِ خدا میں جان دی تو حیاتِ جاودانی تو بے شک حاصل کی، ہمیشہ ان کا ذکر

رہے گا، ہمیشہ ان کی یاد قائم رہے گی۔ یہ حیاتِ جاودانی بھی زندگی ہے مگر قرآن فقط اس زندگی کو نہیں کہہ رہا ہے جو مجازی زندگی ہے، وہ آثارِ زندگی مرتب کر رہا ہے۔ کہتا ہے:

"اَحۡیَآءٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ یُرۡزَقُوۡنَ"۔

وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے ہاں رزق حاصل کرتے ہیں۔ اپنے پروردگار کے ہاں روزی حاصل کرتے ہیں۔ اب کھانا اور رزق تو زندہ سے متعلق ہے جو ویسی زندگی رکھتا ہو۔ اور اتنا ہی نہیں کہ وہ غذا حاصل کرتے ہیں، رزق حاصل کرتے ہیں:

"فَرِحِیۡنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ"۔

وہ خوش ہوتے ہیں اللہ کے اس فضل و کرم پر جو انہیں ملتا ہے۔

یہ احساسِ شعورِ زندگی جو خوشی اور انبساط کی صورت میں ہے، یہ دوسرا اثر زندگی ہے اور اتنا ہی نہیں کہ اپنے پس ماندگان سے بے خبر ہوجاتے ہیں بلکہ "فَرِحِیۡنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ"۔ یہ روایت نہیں ہے جو ضعیف اور قوی کا خیال ہو۔ یہ قرآن کی آیت پڑھ رہا ہوں۔ اس کا صرف ترجمہ کر رہا ہوں، تبصرہ بھی نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ خوش ہیں اس پر جو اللہ نے انہیں نعمتیں عطا کی ہیں۔ یہ تو جو نعمتیں ان کو عطا ہوئی ہیں، اس پر خوش ہیں۔ اس کا ذکر ہے اس اپنے شعورِ حال کا ذکر ہے، لیکن اس کے بعد:

"وَیَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِالَّذِیۡنَ لَمۡ یَلۡحَقُوۡا بِهِمۡ"۔

اور یہ حالات دیکھ کر جو ان کے بعد دنیا میں رہ گئے ہیں، جو پس ماندگان

ہیں، ان کے حالات دیکھ کر اگر وہ قابل شکریہ ہیں تو وہ خوش ہوتے ہیں "یَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِالَّذِیۡنَ لَمۡ یَلۡحَقُوۡا بِهِمۡ"، اور ان کے حالات کو دیکھ کر جو ان کے بعد دنیا میں رہ گئے ہیں، پس ماندگان ہیں۔ ان تک نہیں پہنچے یعنی دارِ دنیا میں زندہ ہیں، انہیں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں کہ نہ ان کو خوف ہے، نہ کوئی صدمہ ہے۔ یعنی یہ اطمینان زندگی ان کی بسر ہو رہی ہے۔ وہ شہید کہیں ہوئے ہیں اور یہ پس ماندگان کہیں پر ہوں لیکن روایت نہیں، آیت کہہ رہی ہے کہ وہ ان کے حالات کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ تو یہ شہید ہیں، انہیں قرآن نے حاضر و ناظر نہیں کہا تو اور کیا کہا ہے؟ اگر وہ دیکھتے نہیں ہیں تو خوش کیسے ہوتے ہیں؟

اس کے معنی یہ ہیں کہ جو جہاں پس ماندگان میں سے ان کے ہے، ممکن ہے ایک کہیں ہو، دوسرا کہیں اور ہو۔ ایک کسی ملک میں ہو، دوسرا کسی اور ملک میں ہو۔ مگر ان سب کے حالات سے تعلق رکھتے ہیں، دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کے حالات کا مشاہدہ کرتے ہیں، اس سے متاثر ہوتے ہیں، خوش ہوتے ہیں۔

جنابِ والا! یہ شہید کیلئے قرآن کہہ رہا ہے تو رسول کے بارے میں یہ بحث کیسی کہ وہ حاضر و ناظر ہیں یا نہیں؟ اسی سے حیات النبی کا مسئلہ حل ہوجاتا ہے۔ غیروں میں کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ ایک حیات النبی ثابت کر رہا ہے اور ایک حیات النبی کا انکار کر رہا ہے۔ اس پر مناظرے ہوا کرتے تھے۔ اس سب کو ہم باہر سے تماشائی کے طور پر دیکھا کرتے تھے کیونکہ ہمارے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ ہمارے اندر کوئی محاذ نہیں تھا۔ دوسروں کے حالات کو ہم دیکھتے تھے کہ ایک حیات النبی پر دلائل پیش کر رہا ہے اور ایک حیات النبی کے خلاف دلائل پیش کر رہا ہے۔ ہم چونکہ حیات النبی والوں کے ساتھ ہیں، اس بناء پر میں حیات النبی کے مسئلہ کو اسی سے طے کیا کرتا تھا کہ شہداء کیلئے قرآن نے کہا ہے۔

بنص قرآن جو حیات النبی کے منکر ہیں، وہ بھی حیات الشہداء کے قائل ہیں۔ تو شہداء کی زندگی کے وہ بھی قائل ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ شہداء کی زندگی کے آپ سب قائل ہیں۔ شہادت ہے کیا چیز؟ یاد رکھئے کہ شہادت ان کی ایک تعلیم پر عمل کرنے کا نام ہے۔ قرآن کے دباؤ سے شہید کی زندگی پر آپ مجبور ہیں اور جس کے گھر سے زندگیِ جاوید کی بھیک بٹ رہی ہو، اس کو کہا جائے کہ زندہ ہے تو آپ کہیں کہ کوئی ثبوت اس کا نہیں ہے۔ اسی طرح سے یہاں بھی کہتا ہوں کہ شہداء کیلئے قرآن سے ثابت ہے کہ جہاں جہاں اس کا عزیز ہو، اس کے حالات پر وہ نگران ہے، اس کا نام حاضر و ناظر ہے یا نہیں؟ جب حاضر و ناظر اس کا نام ہے تو شہید کیلئے یہ کہا گیا تو جو شہید ساز ہو، اس کے بارے میں یہ تصور، یہ بحث کیسی۔ ہاں! نہ وہ زندگیِ جاوید اپنی طرف سے ہے، نہ یہ حاضر و ناظر ہونا اپنی طرف سے ہے۔ اللہ کا دیا ہوا ہے، خدا کا عطا کردہ ہے۔ بس یاد رکھئے کہ ہر کمال کو کہہ دیا کہ ان کا ہے، ذاتی طور پر خدا سے بے نیاز ہو کر تو شرک ہے۔ جب خدا کی طرف سے مان لیجئے تو عین توحید ہے۔

جب خدا کی راہ میں جان دی جائے تو تہذیبِ جہاد ہوگئی کہ امام سے اذن لیا جائے اور تہذیب اس لئے کہہ رہا ہوں کہ سب اس مقصد سے جمع ہیں۔ اسی مقصد سے آئے ہیں مگر یہ کہ جب کوئی آگے بڑھتا ہے تو اجازت لے کر بڑھتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ قرائن والی اجازت نہیں بلکہ باضابطہ اجازت کی ضرورت ہے اور اسے کیسے کیسے سخت مواقع پر نبھایا ہے کہ نابالغ بچہ ہے شہزادہ قاسم۔ چونکہ ہر جہاد میں اب تک بچے الگ رکھے گئے تھے، بدر میں، اُحد میں، خندق میں، خیبر میں، حالاتِ صحابہ میں کچھ صحابہ کے ذکر میں ملتا ہے کہ یہ جانا چاہتے تھے اُحد میں اور رسول نے کم عمر کہہ کر واپس کر دیا کہ ابھی ان کی عمر اتنی نہیں ہے۔

ایک صحابی زادہ کا حال بہت پُرمزاح ہے جو خود انہوں نے بعد میں بیان کیا کہ فلاں جہاد میں جو لوگ کھڑے ہوئے اور رسولؐ گویا معائنہ کر رہے تھے بھیجنے سے پہلے، تو کہتے ہیں کہ میں تڑپ رہا تھا کہ جہاد میں جاؤں۔ میں رسولؐ کے سامنے گیا تو اپنی انگلیوں پر زور دے کر کھڑا ہو رہا تھا کہ میرا قد جتنا ہے، اس سے زیادہ نظر آئے تاکہ رسولؐ یہ نہ فرمائیں کہ یہ کم عمر ہے۔ رسولؐ کو بھی اس کی تڑپ محسوس ہوئی۔ آپؐ نے اس کے کھڑے ہونے کا طریقہ دیکھا۔ آپ نے گویا استثناء کے طور پر ایک سنِ بلوغ کی حد تک پہنچے ہوئے ایک فرد سے کشتی لڑنے کیلئے کہا کہ میں تمہارا جذبہ و بیقراری دیکھ رہا ہوں، شوقِ شہادت دیکھ رہا ہوں۔ یہ بالغ ہے، اس سے کشتی لڑو، اگر اس کو تم نے پٹخ دیا تو میں تم کو اجازت دے دوں گا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں رسولؐ کے سامنے اس سے کشتی لڑا۔

دیکھئے! علماء کو شوق ہو کشتی کا تو شانِ مولویت کے خلاف سمجھا جائے اور یہ رسولؐ ہیں جو اپنے سامنے کشتی لڑوا رہے ہیں۔ گویا ذوقِ جہاد کا امتحان بھی ہے اور طاقت و قوت کا اندازہ بھی ہے اور دوسرے بچوں کے شکایت کرنے کا سدِ باب بھی ہے۔ غرضیکہ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے سے بڑے کو مغلوب کر دیا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ اچھا! میں تمہیں اجازت دیتا ہوں۔

اس سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ روایتِ اسلام تھی کہ بچوں کو جہاد میں شریک نہیں سمجھا جاتا۔ مجھے یہ روایت معلوم ہے، جس گھر کا یہ بچہ ہے اور جس گھر کی یہ روایت ہے، اس بچے کو سب کچھ معلوم تھا۔ ظاہر ہے خاندانِ رسالت میں کربلا کے دن کا چرچا تو رہتا ہی تھا۔ تو نہ جانے کب کب شہزادے نے سوچا ہے کہ کہیں میری کمسنی سنگِ راہ نہ ہو جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری کمسنی باعثِ بد نصیبی ہو جائے۔

مصائب

مگر خاندانِ رسالت کا بچہ تھا، بے موقعہ سوال کرنے کا محل بھی نہیں ہوتا۔ شبِ عاشور جب یہ ذکر آیا، امامؑ نے اجازت دے دی کہ ان کو مجھ سے مطلب ہے اور میں تم لوگوں کو اجازت دیتا ہوں کہ تم چلے جاؤ۔ دنیائے تاریخ میں ایسے موقعہ پر ایسا خطبہ نہیں پڑھا گیا ہوگا۔ ہمیشہ ایسے موقعوں پر جوشِ جہاد دلانے والے خطبے پڑھے جاتے ہیں۔

تو اب جہاد بیان ہوتا ہے، جنت کے تذکرے ہوتے ہیں، دوزخ سے ڈرایا جاتا ہے۔ یہی ہمیشہ ہوتا رہا ہے لیکن یہ انوکھا خطبہ تھا کہ امامؑ نے فرمایا کہ دیکھو! یہ رات تاریک ہے:

"فَتَخِذُوْهُ جَمَلاً"۔

اس رات کی تاریکی کو اپنا مرکب بنالو۔ اس مرکب کی پشت پر سوار ہوکر نکل جاؤ۔ امامؑ کے حکم نے ہماری غلط فہمی کو دور کردیا۔ ہمیں یہ جملہ ملا ہے، آپ نے بھی سنا ہوگا کہ نو (۹) محرم وہ دن ہے جب امام حسین علیہ السلام پر گھیرا ڈال دیا گیا تھا، محاصرہ تھا، گھر گئے تھے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ چاروں طرف سے فوج نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ خیال یہ ہوتا ہے کہ راستے بند تھے، غلط فہمی رہ جاتی ساتھ والوں کے کردار میں یہ تصور ہوتا کہ وہ تو پھنس گئے تھے، جاتے تو کیونکر جاتے؟ امام حسین علیہ السلام نے اس غلط فہمی کو دُور کردیا۔

اب ہماری سمجھ میں آیا کہ راستے بند تھے مدد کیلئے آنے والوں کیلئے، لیکن ساتھ چھوڑنے والوں کیلئے راستے بند نہیں تھے۔ آپؑ نے فرمایا کہ جس کا دل چاہے، چلا جائے اور اس میں ایک احساسِ غیریت ہوتا، لہٰذا یہ جملہ بھی ارشاد فرمایا

کہ ارے میرے عزیزوں کا ہاتھ بھی اپنے ہاتھ میں لے لو یعنی کوئی عون و محمد کو اپنے ساتھ لے جائے، کوئی فرزندانِ مسلم کو اپنے ساتھ لے جائے، کوئی میرے بھتیجوں کو لے جائے، کوئی عباسؑ کو لے جائے، کوئی علیؑ اکبر کو لے جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ جملہ حضرت نے نہ فرمایا ہوتا تو مجمع میں سب سے پہلے مسلم ابن عوسجہ کھڑے ہوتے۔ مگر امامؑ نے یہ جملہ فرمایا کہ جیسے انہیں پریشانی میں ڈال دیا کہ کیا جواب دیں؟ جیسے مولاؑ نے کام بھی اپنا سپرد کردیا۔

اب ہم کہیں کہ جائیں گے یا یہ کہیں کہ نہیں جائیں گے۔ اس رکاوٹ کو دُور کردیا عباسؑ نے کھڑے ہوکر، ورنہ یہ جملہ نہ ہوتا تو عباسؑ کو کھڑے ہونے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ چونکہ حضرتؑ نے یہ جملہ فرمادیا تو ابوالفضل العباسؑ مجمع میں سے کھڑے ہوئے اور عجیب انداز یہ ملتا ہے کہ انہوں نے جب کہنا شروع کیا تو تمام عزیز آواز میں آواز ملا رہے تھے کہ کیوں چلے جائیں؟ کیا اس لئے زندہ رہیں؟ خدا کی قسم! وہ زندگی ہمیں موت سے بدتر ہے جو آپ کا دامن چھوڑ کر بسر ہو۔ جب عباسؑ کہہ چکے اور یہ گویا طے ہوگیا کہ یہ لوگ نہیں جائیں گے۔ تب مسلم ابن عوسجہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے یہ کہا کہ ابھی تو ہمارے ہاتھ میں تلوار ہے، اگر تلوار نہ ہو تو نیزہ لیں گے، نیزہ نہ ہوگا تو کسی اور حربے سے حملہ کریں گے، کچھ اور نہ رہے گا تو پتھر لے لیں گے یعنی عمل محتاجِ ذرائع نہیں ہے۔ جب فرض کا ادا کرنا منظور ہو تو جو ذریعہ ہو، اس کو استعمال کریں گے۔ یہ مسلم ابن عوسجہ نے کہا۔ اس کے بعد زہیر ابن قین کھڑے ہوئے، انہوں نے کہا: ارے یہ تو ایک دفعہ کی موت ہے، اگر ستر دفعہ مارے جائیں اور لاش جلادی جائے اور خاکستر ہوا میں منتشر کردیا جائے اور پھر زندہ کئے جائیں تو تمنا یہ ہوگی کہ آخری دفعہ بھی جان انہی قدموں پر نثار رہو۔ سب نے کہہ دیا کہ ہم نہیں جائیں گے۔

میں کہتا ہوں کہ خدا کی قسم! یہ دنیا کی زندگی جیسی شبِ عاشور شرمندہ ہوئی ہے، ایسی کبھی نہیں ہوئی کہ مولاؑ ان کی زندگیاں واپس کررہے تھے کہ مجھے تمہاری زندگیوں کی ضرورت نہیں ہے اور وہ پھر حسین علیہ السلام کے قدموں پر ڈال رہے تھے کہ اگر آپ کو ہماری زندگی کی ضرورت نہیں ہے تو ہمیں بھی اس زندگی کی ضرورت نہیں ہے۔ جب یہ طے پا گیا کہ کوئی نہیں جائے گا تو قاسمؑ کھڑے ہوئے کیونکہ مدت سے تردد تھا، اب محل ہوگیا اس تردّد کے دور کرنے کا اور اطمینان حاصل کرنے کا۔ مدت سے جو پریشانی تھی اپنی کم سنی کی وجہ سے، اس لئے کھڑے ہوئے کہ کیوں چچا جان! میرا نام بھی دفترِ شہداء میں ہے؟ میں نے محسوس کرلیا کہ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟ معاذ اللہ، مولاؑ نہیں محسوس کر سکتے تھے؟ سمجھے کہ کم سنی کی وجہ سے یہ ڈر رہا ہے، اسے یہ احساس ہے کہ شاید اسے اجازتِ جہاد نہ ملے کم سن ہونے کی وجہ سے۔ تو پہلے تو ایک سوال کرلیا ان کی کم سنی کی بناء پر کہ دنیا یہ نہ سمجھے کہ اس بچے نے بچپنے میں نادانی کی بناء پر ایک بات اپنے چچا سے پوچھی ہے۔ یہ بچہ اصل معاملہ سمجھا ہی نہ تھا، اس لئے مولاؑ نے ایک سوال کرلیا کہ بیٹا! جواب بعد میں دوں گا، یہ بتاؤ:

"كَيْفَ الْمَوْتُ عِنْدَكَ"۔

"تمہارے نزدیک موت ہے کیسی چیز؟"

بس بچہ معرضِ امتحان میں آ گیا، فوراً بلا توقف جواب دیا اور ایسا جواب دیا جو حکماء نے اور دانش مندوں نے نہیں دیا۔ ارسطو کا کلام بھی ہم نے سنا ہے موت کے بارے میں، افلاطون کا کلام بھی سنا ہے مگر کسی نے موت کا مزہ نہیں بتایا اور بتایا بھی ہے تو تلخ بتایا ہے۔ شہزادے نے جواب اتنا اونچا دیا ہے کہ دنیا کے حکماء نے نہیں دیا۔ مگر محسوس کیجئے کہ شہزادے کے جواب میں کم سنی ٹپک رہی ہے۔ اس سے

بڑا کوئی یہ تشبیہ نہیں دے سکتا، کہتے ہیں: چچا جان! ارے آپ کیا پوچھ رہے ہیں؟

"اَلْمَوْتُ اَحْلٰى مِنَ الْعَسَلِ"۔

"موت تو شہد سے زیادہ میٹھی چیز ہے"۔

معلوم ہوگیا شہزادے کا ذوق کہ شہد بہت پسند تھا۔ کہتے ہیں وہ موت شہد سے زیادہ میٹھی چیز ہے۔ بس مقصد حاصل ہوگیا، اب مولا کو سوال کا جواب دینا ہے۔ میں کہتا ہوں ذرا غور کیجئے جو وجہِ تردّد ہو، اس کی قریب تر مثال پیش کردی جائے تو اطمینان ہوجاتا ہے۔ بچہ یہ کہہ رہا ہے کہ میرا نام بھی ہے یا نہیں؟ وجہِ تردّد کمسنی ہے تو اس لئے ضرورت ہوئی کہ مولاؑ فرمائیں: ارے قاسم! کل تو وہ دن ہے کہ تمہارا چھوٹا بھائی علیؑ اصغر بھی راہِ خدا میں قربان ہوگا۔ جو مقصد مولاؑ کا تھا، وہ بالکل پورا ہوگیا۔ قاسمؑ کو اپنے لئے اطمینان ہوگیا مگر علیؑ اصغر کا جو نام لیا تو ذہن دوسرے پہلو کی طرف چلا گیا۔ گھبرا کر کہنے لگے کہ کیوں چچا! کیا اشقیاء خیموں کے اندر آ جائیں گے؟ بس اب مولاؑ نے شہزادے کا امتحان زیادہ نہیں لیا۔

میری زندگی میں تو یہ مجال نہیں ہے، میں خود ہاتھوں پر علیؑ اصغر لاؤں گا۔

مختصر طور پر کیفیتِ شہادت بیان کی۔ بس اربابِ عزا! رات کو تو اطمینان حاصل کرلیا مگر روزِ عاشور چونکہ اطمینان ہوگیا بچپن کی طرف سے، جب تک اصحاب جارہے تھے، تب تک نہیں کہا۔ خاندانِ رسالت کا بچہ ہے، مگر جب عزیزوں کی باری آئی تو فرزندانِ مسلم جانے لگے، قاسمؑ نے کہا: چچا! ہمیں اجازت دیجئے۔ فرزندانِ جعفر جانے لگے، کہنے لگے کہ چچا! ہمیں اجازت دیجئے۔ مگر اب مولاؑ یہ نہیں فرماتے کہ ابھی نہیں بلکہ ہر دفعہ جواب میں فرماتے ہیں: تمہیں کیونکر بھیجوں؟ یعنی جیسے شہزادے کیلئے ایک معمہ بن گیا۔ رات کو تو اطمینان دلا چکے تھے مگر اجازت تو دیتے ہی نہیں،

کروں کیا؟ دیکھئے اجازت کتنی ضروری شرط ہے، اجازت نہیں دیتے، کیا کروں؟ میں کہتا ہوں کہ اجازت کیونکر دیں؟ شریعتِ اسلام میں بچہ اپنی ذات کا مالک نہیں ہے۔ بچے کا مالک باپ ہے یا دادا، یہاں نہ باپ موجود ہے، نہ دادا موجود ہے۔ وہ امامت کا علم تھا جس کی بناء پر خبر دے دی تھی اور یہ آئین شریعت ہے جس کی بناء پر بے بسی کا اظہار کررہے ہیں۔ اتنا انکار کیا، اتنا انکار کیا، اور اصرار اُن کا اور اُن کا انکار اتنا بڑھا کہ بچہ نا اُمید ہوگیا۔ تھک کر ایک عمودِ خیمہ سے لگ کر بیٹھ گیا۔ کوئی مرنے سے کیا اتنا گھبرائے گا جو یہ جینے سے گھبرا رہا ہے؟ کیا کروں، کیا کروں؟ ایک مرتبہ یاد آیا کہ میری ماں نے بیان کیا ہے کہ میرے بابا نے دنیا سے جاتے وقت میرے بازو پر ایک تعویذ باندھا تھا اور یہ کہا تھا کہ جب سخت وقت پر کوئی مشکل منزل آئے تو اس تعویذ کو کھول لینا اور اُس پر عمل کرنا۔ جب انہوں نے اپنے دل سے پوچھا کہ کیوں قاسمؑ! اس سے بڑھ کر کوئی سخت وقت ہوسکتا ہے؟ ضمیر نے کہا کہ اس سے سخت وقت کوئی نہیں ہوسکتا۔ تعویذ کو کھولا تو دیکھا کہ اس میں لکھا ہے کہ اے قاسمؑ! اس تعویذ کو تم اُس وقت کھولو گے جب تمہارا چچا نرغۂ اعداء میں گرفتار ہوگا۔ اے قاسم! تم میری طرف سے میرے بھائی کی نصرت کرنا۔ بس قاسمؑ کو کچھ کہنا نہیں تھا۔ وہ تعویذ لے کر آ گئے، وہ نوشتہ امامؑ کے سامنے پیش کر دیا۔ میں کہتا ہوں کہ اب مولاؑ کے دل کی خبر لیجئے، ابھی تک بھیجنے کا حق نہ تھا اور اب روکنے کا حق نہ رہا۔ بچے کو گلے سے لگا کر اتنا روئے، اتنا روئے کہ۔۔۔۔

❀❀❀❀❀